شاہ معین الدین احمد ندوی

حیات و خدمات

مصنف

ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی

ناشر

ادبی دائرہ

اعظم گڑھ (یو، پی)

شاہ معین الدین احمد ندوی

(حیات وخدمات)

ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی

شاہ معین الدین احمد ندوی، حیات وخدمات

ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی

سنہ اشاعت: ۲۰۰۷ء	صفحات: ۱۹۰

Rs. 100/-

ملنے کے پتے:

- ادبی دائرہ، عقب آواس وکاس کالونی رحمت نگر، اعظم گڑھ۔۲۷۶۰۰۱
- فلاحی بکڈپو، مسلم مسافر خانہ روڈ، تکیہ، اعظم گڑھ (یوپی) ۲۷۶۰۰۱
- ڈاکٹر فخر الاسلام اعظمی، شبلی نیشنل پی جی کالج، اعظم گڑھ۔ ۲۷۶۰۰۱
- دارالمصنفین شبلی اکیڈمی، پوسٹ باکس نمبر ۱۹، اعظم گڑھ۔۲۷۶۰۰۱
- ایجوکیشنل بک ہاؤس، شمشاد مارکیٹ، علی گڑھ۔

ناشر
ادبی دائرہ، اعظم گڑھ (ادا)

SHAH MOINUDDIN AHMAD NADVI
HAYAT-O-KHIDMAT
By: Dr. MOHD. ILY AS AZMI

کمپوزنگ: نیاز احمد اعظمی

انتساب

گرامی قدر

مولانا ضیاء الدین اصلاحی

ناظم دارالمصنفین ومدیر معارف

اور

ڈاکٹر فخر الاسلام اعظمی

شبلی نیشنل کالج، اعظم گڑھ

کے نام

****

تربیت سے جن کی میں انجم کا ہم قسمت ہوا

ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی

مصنف

ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی

اردو ادب کے معروف لکھنے والے، متعدد مقالات اور کتابوں کے مؤلف، تحقیق وعلم کی مشرقی اور اسلامی روایات کے پاسدار، فکر شبلی وسلیمان کے پارکھ اور ترجمان، محنت، علم، تحقیق اور فکر ونقد میں انفرادیت کے حامل، استاذ ادب اردو مگر اسلامیات سے وابستہ، ان تھک محنت اور بلند پایا تحقیقات کے دلدادہ، علم وکمال کی دنیا میں ابھرتے ہوئے نوجوان محقق وعالم۔

(پروفیسر محمد یٰسین مظہر صدیقی)

مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

فہرست

حرفِ آغاز

☆ مولانا ڈاکٹر محمد نعیم صدیقی ندوی
(ابوظہبی شریعہ کورٹ)

بیسویں صدی کے طلوع آفتاب کے ساتھ ہی اس کی شعاعوں سے اردو زبان و ادب کا چمن لہلہا اٹھا اور اس کے ربع اول میں آسمان علم وفن پر کواکب و نجوم کی کہکشاں بکھر گئی، علامہ شبلی اور ان کے دبستان فکر کو اس ادبی کہکشاں میں کوکب تاباں کی حیثیت حاصل ہے، دبستان شبلی کے ادیبوں کا طرۂ امتیاز یہ ہے کہ انھوں نے اردو زبان کو مذہب و تاریخ کا سرمایہ دار بنایا اور تحقیق و تنقید کو گلے ملا کر اپنی علمی اور ادبی تخلیقات میں وزن اور وقار پیدا کیا، واقعہ یہ ہے کہ اس دبستان کے اہل قلم نے اپنے بانی کے تحقیقی و ادبی مسلک کی جس شدت اہتمام کے ساتھ متابعت کی اس کی نظیر اردو زبان کی پوری تاریخ میں مفقود ہے۔

علامہ شبلی نے بیسویں صدی کی دوسری دہائی میں دارالمصنفین کی تاسیس کر کے دراصل اس کے ذریعہ اپنے ادبی افکار، تحقیقی روش اور اسلوب زبان کی نہ صرف حفاظت بلکہ اس کے فروغ کی ضمانت بھی فراہم کردی تھی اور حقیقت یہ ہے کہ دبستان شبلی کے گل سرسبد علامہ سید سلیمان ندوی نے اپنے مایۂ فخر استاذ کے اس خزانہ عامرہ کو ایک ایسی تابندہ روایت کی حیثیت عطا کردی جس کا چراغ تاہنوز روشن ہے اور انشاء اللہ چراغ سے چراغ جلنے کا یہ سلسلۃ الذہب ابدالآباد تک قائم رہے گا۔

داتا رکھے آباد اس ساقی تری محفل کو

راقم السطور اپنی سعادت پر رہتی زندگی مفتخر رہے گا کہ اس کو دارالمصنفین سے گوناگوں جہتوں سے ربط و تعلق رہا ہے، اسی باعث دارالمصنفین اور اس کے اکابر کا نام نوک زبان وقلم پر آتے ہی اس کے قلب میں عقیدت ومحبت کی پھواریں پھوٹنے لگتی ہیں۔ اللہ جل شانہ نے ایک پسماندہ شہر میں اس چھوٹی سی جگہ سے عظیم الشان کام لیے ہیں، یہاں سے پھوٹنے والی علم وادب کی خوشبو نے ایک عالم کو مہکا رکھا ہے، یوں تو عاجز کی تمام تر نشو ونما اسی احاطہ (Campus) میں ہوئی ہے مگر وہ اپنے عنفوان شباب کے قیمتی پندرہ سال تک اس ادارہ سے باضابطہ منسلک رہا ہے، اسی کی علم پرور فضاؤں میں قلم پکڑنے کا سلیقہ سیکھا اور اس کے عہد آخر کے اساطین علم کے سانسوں کی مہک سے اپنے قلب ودماغ کو معطر کیا ہے، ان ہی وجوہ سے جب عزیز مکرم ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی نے اپنی پیش نظر علمی کاوش ''شاہ معین الدین احمد ندوی، حیات وخدمات'' پر مقدمہ لکھنے کی اصرار آمیز فرمائش کی تو اپنی کم مائیگی کے کامل احساس کے باوجود عاجز نے بطور سعادت اس کو قبول کرلیا۔

استاذ الاساتذہ علامہ سید سلیمان ندوی نے جب بعض تکوینی حالات کے تحت آستانۂ استاذ سے جدائی اختیار فرمائی تو دارالمصنفین کی زمام نظامت استاذی المرحوم شاہ معین الدین ندوی نے اس شان جمال وکمال کے ساتھ سنبھالی کہ خود حضرت سید صاحب بھی اس کے معترف ہوگئے، واقعہ یہ ہے کہ حضرت شاہ صاحبؒ نے دارالمصنفین کی علمی روح اور شاندار روایات کو برقرار رکھنے اور اس کے وزن ووقار کو معراج عطا کرنے میں اپنی تمام علمی و ادبی صلاحیتوں کو غایت کامیابی کے ساتھ صرف کردیا، وہ حضرت سید صاحب کے خصوصی تربیت یافتہ اہل قلم تھے اس لیے ان کا اسلوب، زبان وبیان کے تمام محاسن کا امین تھا جو ان کے استاذ علام کا طرۂ امتیاز تھے، وہ نہایت شستہ وشگفتہ اور رعنا وشاداب اردو لکھتے تھے۔

حضرت شاہ صاحب علیہ الرحمہ نے اپنی علمی وتحقیقی خدمات سے نہ صرف دارالمصنفین بلکہ اردو زبان کے ادبی ذخیرہ میں گرانقدر اضافہ کیا ہے، خاص طور پر چار جلدوں پر مشتمل ''تاریخ اسلام'' ان کا ایک یادگار کارنامہ ہے، ان کی ادبی خوش ذوقی اور سخن فہمی کی بہار

دیکھنی ہو تو ''ادبی نقوش'' کا مطالعہ کیا جائے، اس میں حضرت شاہ صاحب نے خاص طور پر اصغر، حسرت اور اقبال کے کلام پر جو تنقیدی مضامین لکھے ہیں ان کی گونج ادبی حلقوں میں عرصہ تک موجود رہی اور آج بھی ان کی ادبی رائے کو ایک مستند حوالے کی حیثیت حاصل ہے۔

یوں تو اس بے مایہ راقم السطور کی عمومی تربیت متعدد شخصیات کی رہین منت ہے لیکن میرے نادیدہ استاذ ماہر القادری اور استاذی المرحوم شاہ معین الدین احمد ندوی کے احسانات بے پایاں سے یہ گردن خاص طور پر گراں بار ہے، ان دونوں نے مجھے قلم پکڑنے کا سلیقہ سکھایا اور اپنی مردم گری سے میرے علمی وادبی ذوق کو صیقل کرنے میں بڑی محنت صرف کی، مولانا ماہر القادری ایک بلند پایہ شاعر اور بے مثل ادیب و نقاد تھے، اردو زبان کے نوک پلک کا ایسا ماہر اور پارکھ روز روز پیدا نہیں ہوتا ہے، صحت زبان اور نقد و جرح میں ان کے اصول بہت سخت بلکہ بے رحم تھے، حضرت شاہ صاحبؒ اگر چہ ماہر صاحب کی علمی گہرائی کے قائل نہ تھے تاہم ان کی لسانی مہارت اور اسلوب تحریر کے معترف تھے، اسی باعث وہ ''فاران'' کا مطالعہ بڑے شوق و دلچسپی سے کیا کرتے تھے۔

مولانا ماہر القادری کی دید سے آنکھیں روشن کرنے کی حسرت عاجز کے دل ہی میں رہ گئی مگر اس بے مایہ کی قلمی شخصیت سازی میں ان کی حوصلہ افزا اصلاح و تربیت کا بڑا نمایاں حصہ ہے، اس عہد میں ان کا رسالہ ''فاران'' ایک معیاری ادبی مجلہ شمار ہوتا تھا، مرحوم کا یہ احسان ناقابل فراموش ہے کہ انھوں نے اٹھارہ انیس سال کے ایک نوجوان کی خالص مبتدیانہ قلمی کاوشوں کی اپنے معیاری رسالہ میں اشاعت سے کبھی معذرت خواہی نہیں کی بلکہ پوری محنت کے ساتھ میرے مضمون میں حک و اصلاح کر کے شائع کر دیا کرتے تھے، کبھی تو ایسا بھی ہوا کہ مطبوعہ مضمون میں مجھے اپنے الفاظ تلاش کرنے پڑتے تھے، اس حوصلہ افزائی سے میں نے کما حقہ فائدہ اٹھایا جو اب تک کام آرہا ہے، اور بلاشبہ اس سے مہمیز پا کر میں نے ''فاران'' میں خوب خوب لکھا اور چند سالوں کے بعد ماہر صاحب کی اصلاحات کا سلسلہ ختم ہو گیا۔

مولانا شاہ معین الدین ندوی تو خیر سے میرے استاذ کامل ہی تھے، اس بے بضاعت

کا پورا قلمی وجود ان کی تربیت کی بنیادوں پر قائم ہے وہ "کَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ اَصْلُهَا ثَابِتٌ وَّ فَرْعُهَا فِي السَّمَاءِ" کا مصداق تھے، راقم السطور نے زندگی میں اتنی جامہ زیب اور باوقار شخصیتیں کم دیکھی ہیں، سرخی مائل گوراچٹا رنگ، چہرہ ہمہ وقت گلاب کی طرح متبسم، باتوں میں بلا کی معصومیت، ہونٹوں پر پان کی لالی، تکلف و تصنع سے دور، دیکھو تو پہلی ہی نظر میں دل میں گلاب کھل اٹھیں، وہ جب گاندھی کیپ کے ساتھ لمبی شیروانی، علی گڑھ کٹ پاجامہ، چہرہ پر خوبصورت چشمہ اور ہاتھ میں چھڑی لے کر چلتے تو لگتا وجاہت و جمال کا مجسمہ جنبش میں ہو۔

راقم کو متعدد بار سفر میں بھی (دینی تعلیمی کونسل کی علاقائی کانفرنس کی صدارت کے لیے) بطور خادم شاہ صاحب کی رفاقت کا شرف حاصل ہوا ہے، اس وقت وہ ہر قدم پر مخدوم سے زیادہ خادم بننے کی کوشش کرتے تھے، سیرت و کردار کی یہ خوشبو دراصل ان کے مقدس اسلاف کی سیرتوں سے پھوٹی تھی، وہ اودھ کے ایک ممتاز ترین خانوادۂ تصوف و معرفت کے پر نور چشم و چراغ تھے اور اودھی تہذیب و ثقافت کا ایک مثالی پیکر، شاہ صاحب اپنی روزمرہ گفتگو میں اودھی لہجہ استعمال کرتے تو ان کے منہ سے بڑا بھلا لگتا تھا، جب وہ عاجز کو آواز دیتے "نعیم بھیاں آؤ" تو اس پیارے انداز پر وار جانے کو جی چاہتا تھا، ولادت سے رفاقت تک میری زندگی کے بیس سال ان کی نظروں میں مثل آئینہ شفاف تھے اسی لیے وہ سب سے میرا تعارف "دارالمصنفین کی تاریخ کے سب سے کم سن اور خانہ ساز رفیق" کی حیثیت سے کرایا کرتے تھے، اللہ رے! "زمین کھا گئی آسمان کیسے کیسے"

حضرت شاہ صاحبؒ نے جنوری ۱۹۶۸ء میں اس عاجز کو سو روپے مشاہرہ پر رفیق دارالمصنفین کے منصب پر مامور فرمایا تھا اور پھر دارالمصنفین کی روایات کے مطابق میری علمی تربیت پر انھوں نے توجہ مرکوز فرمادی، ایک دن حکم فرمایا کہ "معارف" کے لیے حافظ ابن حجر عسقلانی پر ایک مبسوط مقالہ لکھو، چنانچہ تقریباً چار ماہ کی عرق ریز اور جانکاہ محنت کے بعد فل اسکیپ سائز کے سو صفحے کا مضمون پیش خدمت کردیا جو اسی زمانہ میں "معارف" کی تین قسطوں میں شائع ہوا، یہاں عرض کرنے کی اصل بات یہ ہے کہ استاذی المرحوم "معارف" کے

معیار کو برقرار رکھنے کے لیے تمام مضامین کے نوک پلک مضمون نگار کی شخصیت کی کسی رورعایت کے بغیر درست کرتے تھے، حک واصلاح میں ان کو بڑی مہارت حاصل تھی، وہ ہر مضمون کے حشو وزوائد اس طرح صاف کردیتے تھے جیسے مالی چمن کے خس وخاشاک کی صفائی کردیتا ہے اوران کی اصلاحات کو ملک کے مستند مقالہ نگار بھی بطیب خاطر قبول کرتے تھے۔

چنانچہ حضرت شاہ صاحب نے عاجز کے مذکورۃ الصدر مقالہ کے مسودہ پر بھی بڑی بے رحمی سے نشتر لگائے بلکہ سطروں کیا پورے صفحہ کا قتل عام کرکے اس طویل مقالہ کو تقریباً نصف کردیا، نوجوانی کے زعم میں وقتی طور پر بڑی دل شکنی ہوئی مگر جب راقم نے مسودہ کا بغائر نگاہ سے جائزہ لیا تو قلم زد پورے صفحہ کی جگہ حضرت الاستاذ مرحوم کا ایک چھوٹا سا پیراگراف کئی صفحوں پر بھاری نظر آیا، اس میں جامعیت کے ساتھ وہ سب کچھ موجود تھا جو میں نے پورے صفحہ میں لکھا تھا، ہائے یہی اعجاز نما ایجاز شاہ صاحب کے اسلوب کی جان تھا، مذکورہ مقالہ کی اشاعت کے کچھ عرصہ بعد ایک دن شاہ صاحب نے بلاکر فرمایا ''دیکھو! تحریر کا کمال اطناب وتطویل نہیں، ایجاز واختصار ہے، کم سے کم الفاظ میں زیادہ سے زیادہ بات کہنے کا سلیقہ سیکھو''

حضرت شاہ صاحب رفقائے دارالمصنفین کی تربیت بڑے اخلاص اور محبت و شفقت کے ساتھ فرماتے تھے، جس زمانے میں راقم حافظ ابن حجر پر مضمون لکھا تھا، مرحوم میرے نوشت وخواند کے مخصوص کمرے کے سامنے سے گزرتے ہوئے دریافت فرماتے ''کون کون سے مصادر سے استفادہ کررہے ہو؟'' اور ''ہاں، دیکھو! فلاں فلاں مراجع کا مطالعہ ضرور کرلینا'' اور ''یاد رکھو! لکھنے میں جلدی نہ کرنا، بلکہ اتنا پڑھو، اتنا پڑھو کہ ظرف چھلک اٹھے پھر لکھنے بیٹھنا'' اور ''اسلوب میں شگفتگی اور وقار پیدا کرنے کے لیے شعر العجم اور حیات شبلی بار بار پڑھو۔'' وغیرہ وغیرہ۔ رفقا کی تربیت کا یہ انداز دراصل ان کے استاذ حضرت سید صاحب کا قیمتی ورثہ تھا۔

راقم سطور کتب خانہ کھلنے سے کافی پہلے دارالمصنفین پہونچ جاتا تھا، اس وقت شاہ صاحب ناشتہ سے فارغ ہوکر اپنی رہائش گاہ کے برآمدہ میں تشریف فرما ہوتے، میں اس زریں موقع سے پورا فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتا، ایک دن میں نے مطالعاتی کتب کے بارے میں

استفسار کیا تو فرمایا:

''سرسید کی خطبات احمدیہ، مولانا شبلی کی الفاروق اور شعر العجم اور سید صاحبؒ کی حیات شبلی کا مطالعہ بار بار کرو''۔

پھر اس کی وضاحت دوسرے دن یوں فرمائی:

''میں نئے رفقا کو دوران تربیت یہ کتابیں پڑھنے کا مشورہ اس لیے دیتا ہوں کہ خطبات احمدیہ اور مقدمہ سیرت النبی سے مستشرقین کی دسیسہ کاریوں سے واقفیت کے علاوہ استدلال کا سلیقہ آتا ہے، شعر العجم کے مطالعہ سے اسلوب میں شگفتگی پیدا ہوتی ہے اور حیات شبلی سے تحریر میں سنجیدگی اور وقار پیدا ہوتا ہے۔''

اور واقعہ یہ ہے کہ خاص طور پر شعر العجم کے پندرہ سو صفحات میں علامہ شبلی نے ادب و انشا کے جو موتی رولے ہیں ان سے ذہن کو بالیدگی اور قلب و روح کو نہایت سرور و سرشاری حاصل ہوتی ہے، شبلی نے محض اپنے اسلوب کی طاقت سے اردو داں طبقہ کو بھی فارسی شعر و شاعری کا مطالعہ کرنے پر مجبور کر دیا۔

متذکرہ بالا صباحی نشست میں حضرت شاہ صاحب راقم کو روزانہ اپنے قیمتی نصائح اور مشوروں سے نوازا کرتے تھے، ایک دن فرمانے لگے:

''میں رفقائے دارالمصنفین کو تربیتی دور میں اخبارات پڑھنے سے منع کرتا ہوں کیونکہ اس سے زبان و بیان میں صحافیانہ سطحیت اور سخافت پیدا ہونے کا اندیشہ ہوتا ہے۔'' عاجز اس وقت خود شاہ صاحب کے ساتھ تنہا پا کر متنوع موضوعات پر اپنے اشکالات پیش کرتا اور حضرت الاستاذ مرحوم نہایت توجہ اور شفقت کے ساتھ رہنمائی فرماتے تھے، ایک بار راقم نے ایک ممتاز اہل قلم کی تحریروں کی تحسین کی تو فرمایا:

''دیکھو میاں! بعض لوگ لکھے زیادہ ہوتے ہیں، پڑھے کم۔ تمہارے یہ ممدوح بھی اسی طبقہ میں شمار ہوتے ہیں۔'' (اس سلسلے میں شاہ صاحب نے چند اور اہل قلم کے نام بھی لیے)

اس بلیغ جملہ پر میرے تجسس کو محسوس کر کے فرمانے لگے:

"کچھ لوگوں کا علمی پس منظر ناقص، اور مطالعہ سطحی ہوتا ہے، مگر اللہ نے ان کو لکھنے کا جو غیر معمولی ملکہ عطا فرمایا ہے اس کے باعث وہ اپنی تحریروں سے قاری کو متاثر کر لیتے ہیں، لیکن علمی گہرائی نہ ہونے کے باعث اس طرح کی تحریروں کی تاثیر وقتی ہوتی ہے۔"

حضرت شاہ صاحب نے بلاشبہ بڑی طاہر اور پاکیزہ زندگی گزاری، ورع وتقویٰ، اخلاص وللّٰہیت، شریعت وطریقت اور قدسی صفتی میں ان کی زندگی بلا ریب رشک ملائک تھی، ان کے چہرہ کے گرد نورانیت کا ہالہ، شخصیت کی مقناطیسیت میں اضافہ کرتا تھا، وقت پر باجماعت نماز کی ادائیگی کا اتنا شدید اہتمام کم ہی دیکھنے کو ملتا ہے، انتقال کے وقت بھی وہ نماز عصر کی تیاری میں تھے۔ آخر زندگی میں انھوں نے کوچۂ سلوک وتصوف کا رخ کر لیا تھا، جس سے ان کی نگاہوں میں مرد مومن کی اس معجز نما نگاہ کا عکس پیدا ہو گیا تھا جو تقدیریں بدلنے کی قدرت رکھتی ہے۔

حضرت مرحوم نے وفات سے قبل کئی سال تک رمضان المبارک میں تراویح کی نماز اس سیہ کار کی اقتدا میں پڑھی، عاجز اس زمانہ میں مسجد دارالمصنفین کا مستقل خطیب وامام بھی تھا، مرحوم کی عالی ہمتی اور بلند عزیمتی کا یہ عالم تھا کہ وہ اپنی پیرانہ سالی کے باوجود بیس رکعت میں ڈیڑھ پارہ قرآن استقامت کے ساتھ کھڑے ہو کر سنتے تھے، اس معمول میں انھوں نے کبھی تساہل وتکاسل کو راہ نہیں دی۔

اسی باعث جب شاہ صاحبؒ کا جنازہ شبلی کالج کے وسیع میدان میں رکھا گیا تو انسانوں کے بے پناہ ہجوم میں سید صباح الدین صاحبؒ کی اندوہ گیں آواز فضا میں ابھری، "شاہ صاحب کا مستقل امام ہی ان کی نماز جنازہ کی امامت بھی کرے۔"

چنانچہ اس سیہ کار نے چشم اشکبار اور قلب مضطرب کے ساتھ آگے بڑھ کر یہ پرسعادت فرض انجام دیا، ہائے اس وقت کی کیفیت! یوں لگا ابھی شاہ صاحب بول پڑیں گے:

"نعیم ھُواں کاہے کھڑے ہو، ہِیاں پاس آؤ۔"

حاصل کلام یہ کہ استاذ مرحوم شاہ معین الدین احمد ندوی عہد آخر میں نہ صرف دارالمصنفین کا وقار اور آبرو تھے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ وہ حضرت سید صاحب کے بعد دبستان شبلی

کے میر کارواں تھے، ان کے تخلیقی اکتسابات، جو ہمارے علمی خزانے کا انمول موتی ہیں، بیشتر تاریخ، سوانح اور اسلامیات کے محور پر گردش کرتے ہیں، لیکن بایں ہمہ انھوں نے ادب وتنقید کے گلستانوں کی بھی آبیاری کی ہے، ان کی قلمی جولانیاں سنجیدہ وادبی صحافت تک وسیع تھیں، یہ ان کا یادگار کارنامہ ہے کہ انھوں نے رسالہ ''معارف'' کے توسط سے باوقار، سنجیدہ اور ٹھوس علمی و تحقیقی مضامین لکھنے کی روایت کو ملک میں فروغ دیا اور اس کی پوری ایک نسل تیار کی۔ فرحمه الله رحمة واسعة و اسکنه فسیح جناته یا رب العالمین.

حضرت شاہ صاحبؒ کی اس بلندی مرتبت اور عظمت شان کے باوجود مقام صد حسرت ہے کہ ابھی تک ان کی بوقلموں شخصیت اور فکر وفن کا ادراک حاصل کرنے کی کوئی منظم کوشش نہیں کی گئی ہے، پیش نظر کتاب اس سمت میں ایک خوش آئند اور مسرت بخش قدم ہے جس کے لیے عزیز مکرم ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی تمام ذوق شناسان ادب کے شکر و تبریک کے مستحق ہیں، موصوف نے یہ کتاب لکھ کر دراصل حضرت شاہ صاحب کے تلامذہ کی طرف سے فرض کفایہ ادا کیا ہے، یہ کام تو لاریب راقم کے کرنے کا تھا مگر اللہ جل شانہ نے ازل سے ''توفیق باندازۂ ہمت'' مقدر فرما رکھی ہے اور الیاس صاحب اس حیثیت سے یقیناً نصیبہ ور ثابت ہوئے، موصوف عزیز اس سے قبل متعدد باوقار علمی وتحقیقی کارنامے پیش کر کے اب وہ مشک خالص بن چکے ہیں جس کی مشام جاں فروزی کسی عطار کے ادعاو تشہیر کی محتاج نہیں رہ گئی ہے۔

چند سالوں کے بعد دارالمصنفین اپنی تاسیس کی ایک صدی پوری کرنے جارہا ہے، کیا عجب ہے کہ ڈاکٹر الیاس صاحب کی پیش نظر کاوش اس ادارہ کی صد سالہ تقریب کا نقطہ آغاز بن جائے، اللہ جل شانہ کی شان عالی سے قوی امید ہے کہ موصوف کے دوسرے علمی اکتسابات کی طرح اس کتاب کو بھی قبول عام حاصل ہوگا۔

خاکسار

محمد نعیم صدیقی ندوی

ابوظبی شریعہ کورٹ

(متحدہ عرب امارات)

۲۲ ستمبر ۲۰۰۶ء

پیش لفظ

☆ ڈاکٹر خلیق انجم

دنیائے اسلام میں اعظم گڑھ کے دارالمصنفین کو بہت اہم مقام حاصل ہے۔اس علمی ادارے سے علامہ شبلی ،مولانا سید سلیمان ندوی ،مولانا مسعود علی ندوی ،مولانا عبدالسلام ندوی ،مولانا ابوالحسن ندوی علی میاں اور شاہ معین الدین احمد ندوی جیسے علمائے کرام وابستہ رہے ہیں۔ان علماء میں شاہ معین الدین احمد ندوی کو ممتاز مقام حاصل ہے۔

شاہ صاحب کا تعلق اتر پردیش کے ایک مردم خیز قصبے رودولی سے تھا۔رودولی کی سرزمین سے جو صفِ اوّل کے ادیب ،شاعر اور عالم پیدا ہوئے ،ان میں شاہ صاحب کا نام سرفہرست ہے۔چودھری محمد علی رودولوی اور مجاز لکھنوی کا تعلق بھی اسی قصبے سے تھا۔

مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی نے ابتدائی تعلیم و تربیت اور عربی ،فارسی اور دینیات کا علم اپنے نانا شرف الدین احمد سے حاصل کیا۔ابتدائی تعلیم کے بعد شاہ صاحب کو فرنگی محل کے مدرسہ میں بھیج دیا گیا۔فرنگی محل سے فارغ ہونے کے بعد ان کے نانا نے انھیں ندوۃ العلماء بھیج دیا جہاں انھوں نے قرآن ،حدیث ،تفسیر ،فقہ ،کلام وعقائد اور ادب کا مطالعہ کیا۔

شاہ صاحب نے ۱۹۲۴ء میں اپنی علمی ،مذہبی اور ادبی استعداد سے مولانا سید سلیمان ندوی جیسے زبردست عالم کو ایسا متاثر کیا کہ مولانا نے انھیں دارالمصنفین میں رفیق بننے کی دعوت دی۔

یہ میری خوش نصیبی ہے کہ مجھے سید صباح الدین عبدالرحمٰن صاحب سے کئی سال قربت حاصل رہی۔مرحوم انجمن ترقی اردو (ہند) کی مجلسِ عاملہ کے رکن تھے۔میں یہاں یہ بتاتا چلوں کہ ندوۃ العلماء سے فارغ طلبہ کو اپنے تعلیمی ادارے اور اساتذہ سے اتنی عقیدت ہوتی ہے کہ وہ ان کے خلاف ایک لفظ نہیں سن سکتے۔

۱۹۸۶ء میں انجمن ترقی اردو (ہند) میں مولانا سید سلیمان ندوی پر سہ روزہ سمینار تھا۔ جدید زمانے کے ایک نقاد نے بزعم خود علامہ شبلی، مولانا سید سلیمان ندوی اور خاص طور سے مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی کی شان میں نازیبا الفاظ استعمال کیے۔ میں نے صباح الدین صاحب کو کبھی غصے میں نہیں دیکھا تھا لیکن ان نقاد صاحب کی تقریر سن کر صباح الدین صاحب غصے سے لال ہوگئے اور انھوں نے کھڑے ہوکر اُن صاحب کی ایسی دھجیاں اڑائیں کہ وہ صاحب اور تمام سامعین سناٹے میں رہ گئے۔

مجھے ان تینوں حضرات سے دلی عقیدت ہے، جس کا ثبوت یہ ہے کہ میں نے انجمن میں علامہ شبلی اور مولانا سید سلیمان ندوی دونوں پر سہ روزہ سمینار منعقد کیے تھے اور ان سمیناروں کے مقالوں کو بعد میں کتابی صورت میں شائع بھی کیا اور حالات سازگار ہونے پر انجمن مولانا شاہ معین الدین پر بھی سمینار منعقد کرے گی۔ اس لیے صباح الدین صاحب کی یہ ادا مجھے بہت پسند آئی۔ صباح الدین صاحب نے تقریباً آدھے گھنٹے تک علامہ شبلی، مولانا سید سلیمان ندوی اور مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی ان تینوں اکابر کی علمی اور ادبی خدمات پر بھرپور تقریر کی اور چوں کہ مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی پر خاص طور پر اعتراض کیا گیا تھا، اس لیے صباح الدین صاحب نے اپنی تقریر میں آدھا وقت صرف ان کے دفاع میں صَرف کیا۔

میں نے شروع میں کہا تھا کے مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی کو ہندوستان کی علمی، ادبی تاریخ میں بہت ممتاز مقام حاصل ہے، سب سے پہلے اس جوہر کو مولانا سید سلیمان ندوی نے پرکھا تھا۔ جیسا کہ بتایا جا چکا ہے کہ انھوں نے مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی کو دارالمصنفین میں رفیق بنا لیا تھا اور جب شاہ صاحب دارالمصنفین میں آگئے تو سید صاحب نے 'سیر الصحابہ' کی ترتیب و تدوین کا کام ان کے سپرد کیا نیز 'مشرقی ممالکِ اسلامیہ کی تاریخ' لکھنے کا کام بھی سونپا، شاہ صاحب نے عہدِ رسالت سے بنو عباس تک کی مفصل سیاسی، سماجی، تمدنی تاریخ کو 'تاریخ اسلام' کے نام سے مرتب کیا۔ 'سیر الصحابہ' اور 'تاریخ اسلام' دونوں کتابوں کی زبردست پذیرائی ہوئی۔ 'تاریخ اسلام' میں اسلام کی سات سو سال کی تاریخ اس طرح لکھی گئی

ہے کہ پڑھنے والا بہت کم وقت میں تاریخ اسلام سے واقفیت حاصل کر لیتا ہے نیز اس کتاب کا اسلوب اور اندازِ بیان اتنا صاف ستھرا، سلیس اور رواں ہے کہ عام آدمی کو بھی اس کتاب کے مطالعے میں کسی طرح کی پریشانی نہیں ہوتی۔

مولانا سید ابوالحسن علی میاں ندوی بھی ہندوستان کی بیسویں صدی کی ایک عظیم شخصیت ہیں، اگر وہ کسی کی علمی اور ادبی صلاحیتوں اور کارناموں کو سراہتے ہیں تو یہ اس شخص کے لیے اپنے آپ میں ایک سند کا درجہ رکھتا ہے اور اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ واقعی ان تمام صلاحیتوں کا اہل ہے۔ علی میاں نے اپنی کتاب 'پرانے چراغ' میں مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی کو ان الفاظ میں سراہا ہے:

> "ہندوستان کے سر پر سے تقسیم کی جوئے خوں گزر گئی تھی۔ تصنیفی و تحقیقی اداروں کے لیے جن کی بنیاد اسلام کے خزانہ عامرہ کی حفاظت و اشاعت پر تھی اور جن کا خمیر سیرت نبوی ﷺ اور تاریخ اسلام سے اٹھایا گیا تھا زندگی کا میدان تنگ اور مستقبل تاریک سے تاریک تر نظر آرہا تھا، سیاسی اور اقتصادی انقلاب نے علمی ذوق، اسلامی کتابوں کی اشاعت اور تحقیقی کام کو بے وقت کی شہنائی قرار دے دیا تھا، مسلمانوں کا جذبہ اعانت و ایثار مفلوج سا ہو گیا تھا، علمی و دینی اور خصوصیت کے ساتھ بلند پایہ تحقیقی کتابوں کی خریداری اور ایسے اداروں کی سرپرستی کا جذبہ سرد بلکہ مردہ ہوتا جارہا تھا، دارالمصنفین کی کتابوں کے دو مارکیٹ اور اس کے قدردانوں کے دو اہم و فعال حلقے تھے، پنجاب اور حیدرآباد، ایک اس ملک سے کٹ چکا تھا دوسرا انقلاب و حوادث کا شکار تھا۔ ایسی حالت میں انھوں نے (شاہ معین الدین ندوی) دارالمصنفین کی بظاہر ڈوبتی ہوئی کشتی سے اپنی قسمت اور سب صلاحیتیں وابستہ کر دیں اور ایک قلندر صفت درویش اور ایک سر پھرے ملاح کی طرح بے رحم دریا کے بہاؤ کے خلاف اس کو چلانے اور ساحل مراد تک پہنچانے کا عزم کر لیا۔" (پرانے چراغ حصہ اول، ص ۴۵۶۔۴۵۷)

۱۹۴۶ء میں جب بھوپال کے نواب حمید اللہ خاں صاحب نے اصرار کر کے مولانا سید سلیمان ندوی کو بحیثیت قاضی القضاۃ اور امیر جامعہ کی حیثیت سے بھوپال بلا لیا تو ان کے سامنے سب سے بڑا سوال یہ تھا کہ دارالمصنفین جیسے غیر معمولی ادبی اور علمی ادارے کی ذمہ داری کس کو سونپیں۔ اگر اس وقت مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی دارالمصنفین میں نہ ہوتے تو میرا خیال ہے کہ مولانا سید سلیمان ندوی دارالمصنفین سے ہرگز نہ جاتے کیوں کہ مولانا سید سلیمان ندوی صاحب کو اس کا بھرپور اندازہ تھا کہ اس ادارے کی ذمہ داری کو نبھانا اور اس کے علمی معیار کو برقرار رکھنا آسان کام نہیں ہے، انھیں یہ بھی اندازہ تھا کہ ان کے پیچھے اس کام کو سنبھالنے کی پوری صلاحیتیں مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی میں ہیں۔ کچھ عرصے بعد 'معارف' جیسے علمی اور ادبی رسالے کی ذمہ داری بھی مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی کے کاندھوں پر آگئی۔ 'معارف' میں شذرات کا کالم سب سے اہم ہوتا ہے، جس میں مدیر اپنی علمی اور ادبی صلاحیتوں کا بھرپور اظہار کرتا ہے۔ مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی نے اس روایت کو برقرار رکھا۔ انھوں نے علمی، ادبی اور ملکی موضوعات کے علاوہ مسلمانوں کے مسائل پر بڑے متوازن اور عالمانہ انداز میں بصیرت افروز اداریے لکھے۔ ان اداریوں کے بارے میں میرا خیال ہے کہ انھیں مرتب کر کے شائع کیا جانا چاہیے۔ یہ اداریے ہماری پچاس سال کی علمی، سماجی، تہذیبی اور ادبی تاریخ کا حصہ ہیں۔

ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی کو دارالمصنفین کے تمام علماء سے غیر معمولی عقیدت ہے، جس کا ثبوت مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی پر ان کی یہ کتاب ہے۔ یہ نئی نسل سے شاہ صاحب کا ایک ایسا تعارف ہے جو شاید ان کے علاوہ کوئی اور مصنف نہیں کرا سکتا تھا۔ الیاس صاحب نے شاہ صاحب کی تقریباً چودہ تصانیف کا تعارف کرایا ہے، ان میں سے کئی تصانیف ایسی ہیں جو ہمارے ذہنوں سے محو ہو چکی تھیں یا جن سے ہم بالکل واقف نہیں تھے۔ الیاس صاحب کی کاوش سے ہمیں اس تمام بیش بہا سرمائے کا علم ہوا۔

مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی نے قرآن، حدیث، فقہ اور اسلام سے متعلق

مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی نے قرآن، حدیث، فقہ اور اسلام سے متعلق موضوعات، سیاسیات، تذکرہ نویسی، تاریخ اسلام، ادب و لسانیات اور متفرق موضوعات پر بہت سے مضامین لکھے تھے جن میں سے بیشتر 'معارف' میں شائع ہوئے تھے۔ الیاس صاحب نے ان تمام مضامین کی ایک مکمل فہرست بھی اس کتاب میں شامل کر دی ہے۔

مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی نے صرف مذہبی موضوعات پر ہی نہیں لکھا بلکہ علامہ شبلی اور سید سلیمان ندوی کی روایت کو قائم رکھتے ہوئے فارسی اور اردو زبان و ادب پر بھی مضامین لکھے ہیں۔ شاہ صاحب نے مرزا مظہر جان جاناں کی فارسی شاعری کا انتخاب 'خریطۂ جواہر' مرتب کیا تھا۔ ان کا خیال تھا کہ فارسی شعر و ادب کا ذوق کم ہوتا جا رہا ہے اس لیے ممکن ہے کہ اب بہت سے لوگ اس کتاب کے نام تک سے واقف نہ ہوں۔ اس لیے انھوں نے اپنے پسندیدہ اشعار کا انتخاب بھی مع اردو ترجمہ اور تبصرہ شامل کر دیا۔ الیاس صاحب نے زیرِ نظر کتاب میں 'خریطۂ جواہر' کے اس انتخاب کا بھرپور تعارف کرایا ہے۔ الیاس صاحب نے شاہ صاحب کی نثر پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ان کا اسلوبِ نگارش بہت صاف، شستہ اور شگفتہ تھا۔ مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی اردو اور فارسی زبان و ادب کے مزاج داں تھے۔ ان کے تنقیدی نظریات مشرقی تھے اور اس زمانے میں مشرقی تنقید کو تازگی بخشی اور اسے نئی زندگی دی۔

مولانا شاہ معین الدین ندوی نے اردو میں کسی مستقل موضوع پر کتاب نہیں لکھی لیکن ان کے مضامین کا مجموعہ 'ادبی نقوش' کے نام سے شائع ہوا تھا۔ الیاس صاحب نے اپنی کتاب میں ان مضامین پر بھی بہت اچھا تبصرہ کیا ہے۔ کتاب کا آخری باب جو شاہ صاحب کے بعض افکار و خیالات کے تجزیے پر مشتمل ہے اس سے الیاس صاحب کی کد و کاوش کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ غرض یہ کہ الیاس صاحب کی یہ کتاب ضخیم نہ سہی لیکن جامع ہے اور مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی کی پوری شخصیت اور مذہبی، علمی اور ادبی خدمات کا بھرپور احاطہ کرتی ہے۔

ڈاکٹر خلیق انجم

مقدمہ

☆ پروفیسر خورشید نعمانی رودولوی

کسی شخصیت کی تشکیل میں جو عناصر کارفرما ہوتے ہیں ان میں خاندان، تعلیم اور ماحول کو نمایاں حیثیت حاصل ہوتی ہے، خاندان کی روایتی زندگی کے اثرات اس کے ضمیر میں رچ بس جاتے ہیں اور افکار وعقائد اور فکری مؤثرات کے سارے احوال وظروف دور ونزدیک کہیں نہ کہیں سے خاندان، تعلیم اور ابتدائی گرد وپیش سے منسلک ہوجاتے ہیں۔ شاہ معین الدین احمد ندوی بھی اس مفروضہ کے تحت اپنی انفرادیت اور فکری میلانات اور اپنے اجتہادی رنگ وآہنگ کے باوجود اپنے خاندان کی روایتی زندگی کی گرفت سے باہر نہ رہ سکے، انھوں نے جس خاندان میں آنکھ کھولی وہ رشد وہدایت میں ممتاز اور اپنے اعتقاد وعمل اور اس کے اعلان میں بے خوفی اور بے باکی، اس کی دیرینہ روایت بن چکی تھی، شاہ صاحب کے جدی نسب میں شیخ العالم شیخ احمد عبدالحق توشہ رودولوی کا نام نامی سلسلہ چشتیہ صابریہ میں بہت ممتاز نظر آتا ہے جو عہد خلجی کے مشاہیر، صاحب سلوک وطریقت میں سے تھے، ان کے والد شاہ حسنات احمد عربی و فارسی کے عالم، صوفی منش اور مجذوب تھے، شاہ صاحب کی ابتدائی تعلیم ان کے نانا شاہ شرف الدین کی نگرانی میں ہوئی، انہوں نے متوسطات تک تعلیم دارالعلوم فرنگی محل لکھنؤ سے حاصل کی اور دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ سے فارغ التحصیل ہوکر علامہ سید سلیمان ندوی کی خواہش کے مطابق ۱۹۲۴ء میں دارالمصنفین آگئے، یوں تو علامہ سید سلیمان ندوی کی تربیت نے کتنے مس خام کو کندن بنایا ہوگا لیکن ان کی تربیت کا فیض واثر اور صحبت میں جو لوگ سب سے زیادہ فیض یاب ہوئے ان میں اول شاہ معین الدین احمد ندوی دوم سید صباح الدین عبدالرحمٰن تھے، دارالمصنفین میں سید صاحب کی نگرانی میں ان کی تحقیقی صلاحیتیں اجاگر ہوئیں، انہوں نے اس ادارہ سے زندگی بھر کا پیمان وفا باندھا جو ۱۳ر دسمبر ۱۹۷۴ء کو نصف صدی سے زائد ان کی رحلت پر ختم ہوا، ۱۹۴۶ء میں علامہ سید سلیمان ندوی کے بھوپال منتقل ہوجانے کے بعد

دارالمصنفین کے ناظم علمی اور نفس ناطقہ شاہ صاحب ہی رہے، انہوں نے جس دور میں ادارے کی نظامت سنبھالی وہ ملک وملت کا انتہائی پرآشوب دور تھا، ۱۹۴۷ء میں ملک کی تقسیم عمل میں آئی جس سے دارالمصنفین بھی شدت سے متاثر ہوا، اس کی مالی واقتصادی حالت ابتر ہوگئی، تجارت کے تمام ذرائع مسدود ہوگئے، ان حالات میں دارالمصنفین کو چلانا جوئے شیرلانے سے کم نہیں تھا، شاہ صاحب نے انتہائی صبرواستقلال، دوراندیشی اور فہم وادراک سے اس ادارے کو نہ صرف باقی رکھا بلکہ آئندہ کے لیے اس کے استحکام کی راہیں ہموار کیں۔

علامہ سید سلیمان ندوی جیسی قدآور شخصیت کی ہجرت کے بعد ادارے کے معیار کو اس روایتی انداز میں باقی رکھنا اور معارف جیسے رسالہ کے وقار کو جوں کا توں برقرار رکھنا مشکل امر تھا لیکن شاہ صاحب نے یہ دونوں کام جس خوش اسلوبی سے انجام دیئے وہ اظہر من الشمس ہیں، خود سید صاحب نے شاہ صاحب کے شذرات پر اپنی طمانیت کا اظہار کیا۔

شاہ صاحب کا اصل میدان تاریخ اور ادب تھا اور بیشتر انہوں نے اس کوچہ سے قدم نہیں نکالا لیکن جہاں کہیں انہوں نے ان دونوں سے ہٹ کر لکھا ہے ان کی علمی وتحقیقی بصیرت نمایاں ہے وہ شاعر تو نہیں تھے مگر شاعری کے اسرار ورموز سے کماحقہ واقف تھے اور اعلیٰ درجے کے سخن فہم تھے۔

شاہ صاحب کی تصانیف کے بارے میں تفصیل سے لکھنے کا یہ موقع نہیں، ان کی اہمیت ان کے ناموں ہی سے ظاہر ہے۔(۱۔۳) سیر الصحابہ جلد سوم، جلد ششم، جلد ہفتم (۴۔۷) تاریخ اسلام اول تا چہارم (۸) تابعین (۹) عرب کی موجودہ حکومتیں (۱۰) ادبی نقوش (۱۱) دین رحمت (۱۲) حیات سلیمان (۱۳) انوار العیون فی اسرار المکنون، ترجمہ (۱۴) اسلام اور عربی تمدن، ترجمہ (۱۵) خریطۂ جواہر۔

ان تصانیف کے علاوہ شاہ صاحب نے متعدد موضوعات پر سیکڑوں مضامین و مقالات سپرد قلم کئے جن سے ان کی علمی وادبی دلچسپیوں اور لسانی وتحقیقی وتاریخی خدمات کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔شاہ صاحب کی تصانیف ہوں، مقالات یا شذرات ہوں، ان کی ہر تحریر میں توازن اور اعتدال کی کارفرمائی ہے۔سیر الصحابہ ہو یا تاریخ اسلام، ان میں بعض ایسے مواقع آئے ہیں جن سے قلم کی ذراسی بے اعتدالی سے دلوں کو ٹھیس پہنچتی مگر ان کا قلم جادۂ اعتدال سے کبھی ادھر ادھر نہ ہوا۔تاریخ اسلام میں واقعہ کربلا ایک دردناک باب اور عبرت ناک سانحہ ہے

جہاں نواسۂ رسولؐ، حضرت امام حسینؓ کی شہادت، حضرت امیر معاویہؓ کا ذکر اور یزید کی شقاوت کا ذکر ہے۔ وہاں قلم کی ہلکی سی لغزش بڑے مناقشے پیدا کر سکتی تھی، ان حساس موضوعات پر لکھنا رہ بردن تیغ است قدم را کے مصداق تھا، مگر شاہ صاحب اس منزل سے کامیاب اور کامران گذر گئے۔ میں نے بگوش خود صرف سنیوں ہی کو نہیں بعض معتدل شیعہ حضرات کو بھی اس اعتدال پسندی کی تعریف کرتے ہوئے سنا ہے۔

معارف کے شذرات ہماری علمی دنیا میں ہمیشہ خاصے کی چیز رہے ہیں اور ان کی خوبی ان کی اعتدال پسندی و میانہ روی رہی ہے۔ مولانا ابوالکلام آزاد کے سانحہ ارتحال کے بعد علامہ سید سلیمان ندوی اور مولانا آزاد کے متعلق کچھ ایسی تحریریں شائع ہوئیں جن میں اس حقیقت کا برملا اظہار کیا گیا کہ الہلال میں بعض تحریریں جو بغیر نام کے چھپی ہیں، وہ سید سلیمان ندوی کی ہیں، لیکن لوگ انجانے میں انہیں مولانا ابوالکلام آزاد کی تحریریں سمجھ کر پڑھتے اور سر دھنتے ہیں، شورش کاشمیری مرحوم مدیر چٹان لاہور مولانا آزاد مرحوم کے زبردست حمایتی تھے، انہوں نے ان تحریروں پر بڑا واویلا مچایا، شاہ صاحب نے حد اعتدال میں رہ کر سید صاحب کی وکالت کی اور ثابت کر دیا کہ بعض تحریروں کے خالق مولانا سید سلیمان ندوی ہی تھے، یہی معاملہ مولانا عبدالسلام ندوی مرحوم کے ساتھ بھی تھا مگر شورش کاشمیری مرحوم جب اعتدال سے آگے نکل گئے تو شاہ صاحب نے اس معاملے کو طوالت سے بچانے کے لیے یہ مصرعہ لکھ کر اسے ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا۔

بیا کہ ما سپر انداختیم گر جنگ است

اور آخر میں شاہ صاحب کے تدبر، معاملہ فہمی اور اعتدال پسندی ہی کی جیت ہوئی اور عموماً لوگوں نے اسے ہی پسند کیا۔

شاہ صاحب نہایت وجیہ اور شکیل تھے، چہرہ پر رونق، بدن فربہ، رنگ سرخ و سپید، جامہ زیبی تو ان پر ختم تھی، ان کو دیکھ کر حضرت سعدی کا یہ شعر زبان پر آتا تھا۔

اے تماشا گاہ عالم روئے تو
تو کجا بہر تماشا می روی

وہ برصغیر کے مستند اور معتمد مصنفین میں تھے، اور ہندوستان کی سب سے موقر علمی

مجلس دارالمصنفین میں سید سلیمان ندوی کے جانشین تھے، وہ زبان وادب، الفاظ ومحاورات کے استعمال اور زبان کی صحت وسقم کے بارے میں سند کا درجہ رکھتے تھے، ان کا قلم علمی و مذہبی امور میں جادۂ اعتدال سے کبھی نہ ہٹتا تھا، شعر وادب وانشا میں ان کا پایہ بہت بلند تھا، بڑی سلیس شگفتہ، شستہ و رفتہ نثر لکھتے تھے، کم سے کم الفاظ کے استعمال سے کثرت کے مظاہر پیدا کرتے تھے، وہ ایجاز کے قائل اور اطناب کو ناپسند کرتے تھے۔

شاہ صاحب شرافت اور حسن اخلاق کا پیکر مجسم تھے۔ انکساری فروتنی مروت و محبت اور صبر وشکر جیسے اوصاف حمیدہ سے متصف تھے۔ تہذیب وشائستگی اور وقار ومتانت کے خلاف کوئی بات نہ کرتے تھے، ان میں جذبہ خودستائی کا شائبہ ہی نہ تھا۔

شاہ صاحب کی زندگی کا ازدواجی پہلو بڑا غمناک رہا۔ ان کی دو شادیاں اعلیٰ حسبی و نسبی گھرانوں میں ہوئیں، پہلی بیوی سے ایک بیٹا شاہ ودود احمد (جواب مرحوم ہو چکے ہیں) اور دوسری بیوی سے ایک بیٹی غوثیہ خانم بقید حیات ہیں، پاکستان میں ان کی بہو اختر النسا، اور پوتا اور پوتی مقیم ہیں، دو نواسے وطن میں اور دو نواسیاں جن کی شادیاں ہو چکی ہیں، اچھی زندگی گزار رہی ہیں، دونوں بیویوں کے کم عمری میں انتقال کر جانے کے سبب شاہ صاحب نے تقریبا چالیس سال دارالمصنفین کے گوشۂ عافیت میں تجرد کی زندگی گزاری۔ انہیں اپنے وطن سے بہت محبت تھی۔ سال میں تین چار بار وطن جاتے تھے، مگر جلد ہی دارالمصنفین یہ کہہ کر واپس چلے آجاتے کہ سکون قلب اب صرف دارالمصنفین ہی میں ملتا ہے۔

آخرش ۱۳ر دسمبر ۱۹۷۴ء بروز جمعہ نماز عصر کے لیے وضو کر رہے تھے کہ وقت موعود آگیا۔ قلبی دورہ پڑا اور فوراً جان جان آفریں کے سپرد کر دی اور وصیت کے مطابق وطن کی خاک کا پیوند ہو گئے۔ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے اور درجات بلند فرمائے۔ ان کے سانحہ ارتحال پر سید صباح الدین عبدالرحمٰن نے جو شذرہ لکھا وہ ان کی وفیاتی تحریروں میں ایک لافانی تحریر ہے، مولانا علی میاں نے اپنی کتاب پرانے چراغ میں شاہ صاحب کا نثری مرثیہ اس طرح لکھا:

> ''ان چراغوں میں ایک ایسے چراغ کا اضافہ ہو گیا جس کو گھر کا چراغ بلکہ گوہر شب چراغ کہنا بجا ہوگا اور جو کم سے کم ندوہ کی بزم چراغاں میں مشکل سے ایک دو ہستیوں کو مستثنیٰ کر کے جو

عرصہ سے چراغ سحری ہور ہے ہیں سب سے قدیم تھا۔علم وفضل، ادب وانشا، واقفیت اور باخبری، مطالعہ، علمی خدمت اور سب سے بڑھ کر متانت اور شرافت، قدیم وضع داری اور تہذیب اور وقار اور خودداری کے اس چراغ کے گل ہونے پر بزم شبلی وسلیمان کے اس صدرنشیں کے اٹھ جانے پر نالہ زن اور فغاں سنج ہونا ہر طرح برمحل ہے۔اور جتنا ہی حسرت ویاس ہووہ بجا ہے۔

فارسی کا یہ مشہور زمانہ شعر میرے ان جذبات کی ترجمانی کرتا ہے۔

ہرگز نہ میرد آں کہ دلش زندہ شد بعشق

ثبت است بر جریدہ عالم دوام ما"

دارالمصنفین کے تمام رفقایوں تو علمی وادبی مملکت کے قلم رو رہے ہیں اور ان میں سے ہر ایک اس قابل ہے کہ ان پر تفصیل سے لکھا جائے لیکن وہاں کے رفقا کے طبع غیور اور بے نفسی نے کبھی اس کا موقع ہی لوگوں کو نہیں دیا۔زمانہ کی ناقدری کا جس قدر غم کیا جائے کم ہے۔ مگرادھر چند سالوں سے اس اہم کام کی جانب لوگوں کی توجہ منعطف ہوئی ہے۔اس سلسلے میں ایک اہم نام ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی کا ہے،جنہوں نے اسے غالباً اپنی زندگی کا مشن بنالیا ہے اور فی الوقت وہ دارالمصنفین کے ان تمام سابق مرحوم رفقا پر تندہی سے موجودہ سربراہ دارالمصنفین مولانا ضیاء الدین اصلاحی صاحب اور مولانا عمیر الصدیق ندوی کی سرپرستی ورہنمائی میں اپنی تحقیقی کاوشوں کو پیش کررہے ہیں،ان کی موجودہ کاوش کی جولان گاہ شاہ معین الدین احمد ندوی کی حیات اور کارنامے ہیں۔یہ کتاب ہر چند کہ مختصر ہے مگر شاہ صاحب کی زندگی تصانیف، علمی کارناموں اور ان کے افکار وخیالات پر آئندہ کام کرنے والوں کے لیے ماخذ کا کام دے گی۔

میں ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی کو ان کی اس جرأت رندانہ پر دلی مبارکباد پیش کرتا ہوں اور دعا کرتا ہوں کہ وہ آئندہ بھی اس قسم کے تحقیقی وعلمی کام انجام دیں اور ایک کو بہ شب چراغ سے ہزاروں گوہر شب چراغ جلاتے رہیں۔

خورشید نعمانی

(ممبئی)

منظوم تاثرات

از-ڈاکٹر احمد علی برقی اعظمی☆

شاہ معین الدین ندوی مرجع دانشوراں　　تھے وہ شبلی کی روایت کے حقیقی پاسباں

شبلی منزل کے درودیوار سے ہے یہ عیاں　　جلوہ گر ہیں جابجا ان کے نقوشِ جاوداں

ان کی اسلامی ادب پر تھی بہت گہری نظر　　ان کی عظمت کے نشاں ہیں زیب تاریخ جہاں

ان کے گلہائے مضامیں میں ہے فطری تازگی　　ہے معطر جس سے پیہم گلشن اردو زباں

ان کی عصری معنویت آج تک ہے برقرار　　مٹ نہیں سکتے کبھی ان کے نقوشِ جاوداں

ان کی تحریروں میں ہے شعروادب کی چاشنی　　جس کے ہیں مداح یکساں آج سب پیروجواں

قابلِ تحسیں ہے الیاس اعظمی کی یہ کتاب　　ہے شگفتہ اور مرصع جس کا انداز بیاں

ان کے رشحاتِ قلم کا ہے یہ علمی تجزیہ　　ان کے فکروفن کی ہے اس میں حقیقی داستاں

ہو اسے حاصل قبولِ عام برقیؔ ہرطرف

ان کے اعجاز قلم کے ہر جگہ ہوں قدرداں

☆☆☆

☆مترجم/اناؤنسر شعبۂ فارسی آل انڈیا ریڈیو-نئی دہلی

دیباچہ

مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی دبستان شبلی کے ایک نامور ادیب وانشاء پرداز اور مؤرخ ومصنف تھے، ندوہ سے فراغت کے بعد علامہ سید سلیمان ندوی کی خواہش پر دارالمصنفین آئے اور پھر دمِ واپسیں تک تصنیف وتالیف میں منہمک اور علم وتحقیق کی دنیا آباد کئے رہے، سید صاحب علیہ الرحمہ کے پاکستان میں رک جانے کے بعد دارالمصنفین کے ناظم اور ماہنامہ معارف کے مدیر بنائے گئے اور واقعہ یہ ہے کہ ان کی جانشینی کا حق ادا کردیا۔

یہ ہندوستان کا انتہائی پُرآشوب دور تھا تقسیم ہند کی وجہ سے ہر طرف افراتفری اور خلفشار کا بازار گرم تھا، ان نامساعد حالات میں شاہ معین الدین صاحب نے جس دقت اور جانفشانی سے دارالمصنفین کے بقاوتحفظ اور ترقی کے لئے کام کیا اور دارالمصنفین اور معارف کے علمی معیار ووقار کو جس طرح بلند رکھا وہ نہ صرف ان کی زندگی کا عظیم الشان کارنامہ ہے بلکہ دارالمصنفین کی تاریخ کا انتہائی روشن باب بھی ہے۔

ان کی عظمت کے ذکر کے لئے دارالمصنفین کی نظامت اور معارف کی ادارت ہی کافی ہے، تاہم انھوں نے مختلف موضوعات پر ایک درجن سے زیادہ بلند پایہ تصنیفات وتالیفات یادگار چھوڑی ہیں، خود ان کی زندگی مہر ومروت، سادگی وشائستگی اور اخلاقی بلندی کا نمونہ تھی اس لئے ضرورت تھی کہ ان کے حالات وسوانح اور ان کے علمی کارناموں کے نقوش ابھارے جائیں اور دکھایا جائے کہ وہ کس درجہ عظمت وسطوت کے حامل تھے اور ان کے علمی کارنامے ہماری تہذیبی اور تمدنی تاریخ کا کس درجہ اہم حصہ ہیں۔

اسی جذبے کے تحت یہ کتاب سپرد قلم کی گئی ہے، اس میں شاہ صاحب کی سیرت وشخصیت اور تصنیفات وتالیفات کے ساتھ ان کے ادبی اور تنقیدی شعور، تذکرہ نگاری، مورخانہ بصیرت اور ان کے بعض افکار وخیالات کی تفصیل ہے، ان کے اسلوب نگارش کا بھی ذکر ہے، آخر میں اہل علم کے نام ان کے مکاتیب یکجا کئے گئے ہیں جن سے ان کی ذاتی زندگی کے ساتھ

علمی سرگرمیوں کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔

یہ کتاب گو شاہ صاحب کی مکمل شخصیت کا بھرپور جائزہ نہیں، تاہم اس سے ان کے حالات وسوانح اور علمی کارناموں کا ایک اجمالی مرقع ضرور سامنے آجاتا ہے، امید ہے کہ اس سے شاہ صاحب کی عظمت وبلند پائیگی اور ان کے افکار وخیالات کو سمجھنے میں مدد ملے گی، اللہ تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ اس نے اس کام کی توفیق بخشی۔

اس موقع پر اپنے محسنوں اور مخلصوں کا شکریہ ادا کرنا ضروری ہے خاص طور سے اپنے بزرگ سرپرست مولانا ضیاء الدین اصلاحی صاحب ناظم دارالمصنفین کا شکر گزار ہوں کہ انھوں نے اپنے حوصلہ افزا کلمات سے میرے شوق تصنیف وتالیف کو مہمیز کیا، ڈاکٹر محمد نعیم صدیقی ندوی، ڈاکٹر خلیق انجم جنرل سکریٹری انجمن ترقی اردو ہند اور پروفیسر خورشید نعمانی (ممبئی) کا ممنون احسان ہوں کہ ان حضرات نے میری اس کوشش کو نہ صرف پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا بلکہ اپنے گراں مایہ مقدموں سے بھی کتاب کی اہمیت میں اضافہ کیا، خاص طور سے ڈاکٹر محمد نعیم صدیقی کا سپاس گذار ہوں کہ انھیں راقم سے بے پناہ محبت ہے اور وہ میری حوصلہ افزائی اور قدر دانی کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔

مکرمی ڈاکٹر فخر الاسلام اعظمی اور برادرِ مکرم حافظ عمیر الصدیق ندوی رفیق دارالمصنفین کا شکریہ نہ ادا کرنا احسان ناشناسی ہوگی کہ وہ میری تحریروں کو محبت کی آنکھوں سے پڑھتے اور حوصلہ بڑھاتے ہیں، میں مورخ اسلام قاضی اطہر مبارک پوریؒ کے لائق فرزند قاضی ظفر مسعود صاحب کا بھی ممنون ہوں کہ انھوں نے قاضی صاحب کے نام شاہ صاحب کے ۵۸ غیر مطبوعہ خطوط عنایت فرمائے جس سے کتاب کی اہمیت اور ضخامت دونوں میں اضافہ ہوا۔ علمی معاونت کے لئے برادرم سلیم جاوید ناظر کتب خانہ دارالمصنفین کا بھی شکر گزار ہوں، اللہ تعالیٰ ان تمام مخلصین، معاونین اور ہمدردوں کو اچھا رکھے، اور اس کتاب کو مفید بنائے اور حسن قبول کی دولت سے سرفراز کرے۔

محمد الیاس الاعظمی

ادبی دائرہ، اعظم گڑھ۔ ۲۲/اکتوبر ۲۰۰۶ء

(باب اول)

حیات وخدمات

مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی جلیل القدر عالم و مؤرخ، مصنف اور ادیب وانشا پرداز تھے، مدۃ العمر تصنیف وتالیف اور تحقیق وتدوین میں منہمک رہے اور مختلف موضوعات پر ایک درجن سے زیادہ کتابیں اور متعدد مضامین ومقالات لکھ کر علم وفن کی گراں قدر خدمات انجام دیں۔

وہ دارالعلوم ندوۃ العلماء کے نامور فرزند تھے، تعلیم سے فراغت کے بعد مولانا سید سلیمان ندوی کی خواہش پر دارالمصنفین اعظم گڑھ آئے اور انہی سے تصنیف وتالیف کی تربیت حاصل کی اور ان کا شمار اردو کے نامور اہل قلم میں ہوا، سید صاحب کے بعد دارالمصنفین کے ناظم اور ماہنامہ معارف کے مدیر بنائے گئے اور دم واپسیں تک اسی خدمت کو انجام دیتے رہے۔

خاندان اور وطن

مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی مشہور صوفی بزرگ شیخ احمد عبدالحق نوشہ رودولوی علیہ الرحمہ کے خاندان کے چشم و چراغ تھے جن کا شجرۂ نسب حضرت عمر فاروقؓ سے ملتا ہے۔ ان کے جدامجد شیخ داؤد نویں صدی ہجری میں علاء الدین خلجی (۱۲۹۶/۱۳۱۶ء) کے عہد میں بلخ سے ہندوستان وارد ہوکر دہلی میں مقیم ہوئے اور جب سلطان علاء الدین خلجی نے رودولی ضلع بارہ بنکی بطور جاگیر عنایت کیا تو وہ یہاں آکر آباد ہوئے۔ (۱) شیخ داؤد کو خواجہ نصیر الدین محمود چراغ دہلوی سے بیعت وارادت کا شرف حاصل ہوا، شیخ احمد عبدالحق رودولویؒ انھیں کے پوتے تھے جو اپنے وقت کے ایک بڑے صوفی اور صاحب دل بزرگ ہوئے، ان کے بارے میں جناب

سید صباح الدین عبدالرحمٰن تحریر فرماتے ہیں:

''شیخ احمد جن پر بچپن ہی سے نور باطن اور معرفت حق کا غلبہ رہا پیر کی تلاش میں کچھ دنوں سرگرداں رہے پھر پانی پت آکر حضرت جلال الدین کبیر الاولیاء کے ہاتھ پر بیعت کی اور ان سے خلافت پائی، مگر سوز عشق الٰہی اور طلب معرفت کا جذبہ اتنا غالب رہا کہ اولیاء اللہ کی تلاش میں مختلف مقامات کی سیاحت کی۔ سندھ، پنجاب، بنگال اور بہار بھی پہونچے پھر رودولی آکر مسند رشد وہدایت پر متمکن ہوکر سلسلہ چشتیہ صابریہ کے مجدد ہوئے اس کو سب سے زیادہ فروغ ان ہی کی ذات اقدس سے ہوا اور درویش، صاحب تصرف، مظہر خوارق عادات وکرامات، صاحب ذوق وشوق وسکر وفقر وتجرید تسلیم کئے گئے، ایک سو آٹھ (۱۰۸) سال کی عمر میں ۱۵ جمادی الثانی ۸۳۷ھ میں وفات پائی، رودولی میں ان کا مزار اقدس اب تک مرجع خلائق ہے۔(۲)

شیخ احمد عبدالحق رودولوی کو تصوف وسلوک میں اعلیٰ مقام حاصل تھا ان کی عظمت و بلند پائیگی کا اندازہ ان کے اس قول سے بھی لگایا جاسکتا ہے جو انھوں نے منصور کے بارے میں فرمایا تھا کہ ''منصور بچہ تھا جو اس کی زبان سے انا الحق نکل گیا یہاں اللہ کے ایسے بندے ہیں جو سمندر کے سمندر پی چکے ہیں اور ڈکار تک نہیں لیتے''۔(۳)

شیخ احمد عبدالحق رودولوی کے علاوہ بھی اس خاندان میں متعدد علماء و مشائخ اور بزرگان دین پیدا ہوئے جنھوں نے اپنے اپنے حلقے میں علم دین کی بڑی خدمات انجام دیں، جن کا ذکر طوالت کے پیش نظر قلم انداز کیا جاتا ہے۔

والد ماجد

بزرگوں کے اسی خانوادے میں شاہ صاحب کے والد ماجد شاہ حسنات احمد صاحبؒ پیدا ہوئے، وہ عربی وفارسی کے اچھے عالم اور مجذوب صفت انسان تھے۔(۴) شاہ معین الدین

احمد ندوی ان کے پسر اکبر تھے ان کے چھوٹے بھائی کا نام شاہ امام احمد تھا جنھوں نے تجرد کی زندگی گزاری۔

پیدائش

شاہ معین الدین احمد ندوی صاحب ۱۹۰۳ء میں رودولی میں پیدا ہوئے اور اسی صوفیانہ ماحول میں ان کی نشو ونما ہوئی، والدہ کے ضعف و علالت کی وجہ سے ان کی ابتدائی پرورش و پرداخت ایک انانے کی جو بقول جناب رشید نعمانی شاہ صاحب کو پیارے بساون کہا کرتی تھیں اسی لیے قصبہ رودولی میں شاہ صاحب بساون میاں اور بساون بھائی کے نام سے یاد کیے جاتے تھے۔(۵)

تعلیم و تربیت

شاہ صاحب کی ابتدائی تعلیم وتربیت ان کے نانا شاہ شرف الدین احمد کی زیر نگرانی ہوئی جو بڑے متقی اور پرہیزگار اور فرشتہ صفت تھے، ان کے بارے میں جناب سید صباح الدین عبدالرحمٰن مرحوم لکھتے ہیں:

> ''شاہ صاحب کے نانا شاہ شرف الدین صاحب اپنے زمانہ کے ایک اچھے عالم تھے، حیدرآباد دکن حضور نظام کی ریاست میں ایک اچھے عہدہ پر فائز تھے وہاں سے پنشن پانے کے بعد اپنے وطن رودولی ہی میں آخر وقت تک مقیم رہے۔ وہ شاہ امداد اللہ مہاجر مکی کے مرید بھی تھے اور مکہ معظمہ میں ان کے ہاتھ پر بیعت ہوئے، انھیں کی نگرانی میں شاہ صاحب نے بچپن میں تربیت اور ابتدائی تعلیم پائی''۔(۶)

شاہ شرف الدین احمد صاحبؒ کے متعدد مؤثر اور نصیحت آمیز واقعات کتابوں میں ملتے ہیں۔ ایک واقعہ جناب رشید نعمانی صاحب کے الفاظ میں ملاحظہ ہو، وہ لکھتے ہیں:

> ''شاہ صاحب مرحوم کے نانا شاہ شرف الدین احمد صاحب بھی بڑے دانا و بینا بزرگ تھے، ان کی شخصیت میں عجیب کشش سی محسوس ہوتی

تھی، فال خوب دیکھتے تھے، رودولی میں اس وقت ایک بدنام زمانہ شخص تھا جسے لوگ پھیرو میاں کے نام سے جانتے تھے، دُنیا کی شاید ہی کوئی ایسی برائی ہوگی جس سے پھیرو میاں کا دامن آلودہ نہ ہو، بستی کے تمام لوگ ان سے دور رہنا پسند کرتے تھے، ہاں وہ کبھی کبھی شاہ شرف الدین احمد صاحب کے پاس ضرور جا بیٹھتے تھے جو غالباً تنہا ایسے شخص تھے کہ نہ صرف ان کا نام آنا اور بیٹھنا گوارا کرتے تھے بلکہ ان کے ساتھ اخلاق سے پیش آتے تھے، مواعظ حسنہ کے طور پر کبھی کبھی انہیں دو ایک نصیحت بھی کردیا کرتے تھے، خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ ان کی ایسی کایا پلٹ ہوئی کہ ان کے سامنے سے بھاگنے والے لوگ ان کی عبادت وریاضت، کسب حلال کی پابندی، امانت و دیانت نیز تقویٰ و طہارت پر رشک کرنے لگے۔(۷)

شاہ معین الدین احمد ندوی نے ابتدائی تعلیم وتربیت اور عربی وفارسی اور دینیات کی تعلیم انھیں سے حاصل کی، ان کے علاوہ قصبہ کے ایک اور عالم سے جن کا نام معلوم نہ ہوسکا فارسی کی تعلیم حاصل کی اور ان سے گلستان، بوستاں اور پند نامہ وغیرہ سبقاً سبقاً پڑھیں۔(۸)

دارالعلوم نظامیہ فرنگی محل

ابتدائی تعلیم وتربیت کے بعد شاہ شرف الدین احمد صاحب نے اپنے عزیز نواسے کو فرنگی محل کے دارالعلوم میں اعلیٰ تعلیم کے لیے داخل کیا۔ اس وقت فرنگی محل کی پہلی جیسی تب وتاب تو نہ تھی لیکن مولانا عبدالباری جیسی ممتاز شخصیت کے زیر اثر بہرحال وہ اپنی دیرینہ روایات کے مطابق علم وفن کی خدمت انجام دے رہا تھا۔

شاہ صاحب کے فرنگی محل جانے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ ان کے نانا شاہ شرف الدین احمد کو مولانا عبدالباری فرنگی محلی سے بڑی عقیدت تھی، قدیم خاندانی تعلق بھی تھا، مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے ان کے دیرینہ ربط وتعلق کی تفصیل قلم بند کی ہے، وہ لکھتے ہیں:

''فرنگی محل کے خاندان کے حضرت مخدوم صاحب کے خاندان

سے تقریباً ساڑھے تین سو سال کے تعلقات تھے، بانی درس نظامیہ استاذ الہند ملا نظام الدین فرنگی محلی حضرت سید عبدالرزاق بانسوی سے سلسلہ قادریہ میں بیعت تھے اور ان کے تعلق سے ان کے تینوں بھائی سید صاحب کے دست گرفتہ اور وابستہ دامن تھے لیکن ملا نظام الدین کے والد ملا قطب الدین شہید سہالوی مخدوم صاحب کے سلسلہ میں قاضی گھاسی بن داؤد الہ آبادی سے بیعت تھے اس وقت سے فرنگی محل کے علماء مخدوم صاحب سے نسب و نسبت کا تعلق رکھنے والوں کے ساتھ پیرزادوں اور صاحبزادوں کا سا معاملہ کرتے ہیں۔"(۹)

شاہ صاحب نے فرنگی محل میں متوسطات تک تعلیم حاصل کی اور مولانا عبدالباری فرنگی محلی کی عنایات سے بھی فیض یاب ہوتے رہے۔

دارالعلوم ندوۃ العلماء

متوسطات کے بعد انھیں دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ میں داخل کیا گیا، اس وقت ندوۃ العلماء کی شہرت اپنے عروج و شباب پر تھی، شاہ صاحب یہاں تین برس تک قرآن، حدیث، تفسیر، فقہ، کلام وعقائد اور ادب عربی کی تحصیل و تکمیل میں مصروف رہے، انھوں نے جن اساتذہ کرام کے سامنے زانوے تلمذ تہ کیا ان کے اسمائے گرامی یہ ہیں۔

مولانا حفیظ اللہ ندوی، مولانا حیدر حسن خاں ٹونکی، مولانا شبلی فقیہ، مولانا عبدالسبحان دسنوی، مولانا عبدالودود اور مولانا عبدالرحمٰن نگرامی وغیرہ۔

ان میں مولانا عبدالرحمٰن نگرامی سے ان کو خاص تعلق تھا ان کے علم و فضل اور وسعت نظر کے وہ برابر معترف و مداح رہے، شاہ صاحب میں لکھنے پڑھنے کے شوق و ذوق میں اضافہ مولانا عبدالرحمٰن نگرامی کی صحبت و توجہ ہی کا ثمرہ تھا، بقول مولانا عبدالسلام قدوائی "لکھنے پڑھنے کا رجحان شروع سے تھا مولانا عبدالرحمٰن نگرامی مرحوم کی صحبت نے سمند شوق کے لئے مہمیز کا کام کیا۔"(۱۰)

ذہانت وصلاحیت کی وجہ سے ان کا شمارہ ندوۃ العلماء کے ممتاز طلبہ میں ہوا اور اسی بنا پر مولانا سید سلیمان ندوی نے دارالمصنفین کی رفاقت کے لئے ان کا انتخاب کیا، مولانا سید ریاست علی ندوی مصنف تاریخ صقلیہ وتاریخ اندلس ان کے ہم جماعت تھے، تعلیم سے فراغت کے بعد ۱۹۲۴ء میں دونوں ساتھ ہی دارالمصنفین اعظم گڑھ آئے اور رفیق بنائے گئے۔

شادی اور اولاد

اسی زمانے میں ان کا نکاح ان کی پھوپھی زاد بہن عشرت النساء سے ہوا جو شاہ مصطفیٰ احمد جنرل اکاؤنٹنٹ بھوپال کی صاحبزادی تھیں مگر شادی کے چند سال بعد ہی ان کا انتقال ہوگیا ان سے ایک صاحبزادے شاہ ودود احمد پیدا ہوئے جو ۱۹۴۷ء میں پاکستان ہجرت کر گئے اور کراچی میں سکونت اختیار کی۔

شاہ صاحب کی دوسری شادی ان کی والدہ کے اصرار پر جناب منظور الحق نعمانی رودولوی کی صاحبزادی وسیع النساء سے ہوئی مگر انھوں نے بھی مفارقت میں جلدی کی، ان کا جب انتقال ہوا شاہ صاحب کی عمر ۳۵ برس تھی لیکن انھوں نے ان المیوں کے بعد پھر شادی نہیں کی اگرچہ خاندان والوں کا بڑا اصرار رہا تاہم بقیہ زندگی تنہائی وتجرد میں گزاردی۔

ان کی دوسری بیوی سے ایک صاحبزادی غوثیہ پیدا ہوئیں جن کا نکاح رودولی ہی کے چودھری اویس احمد سے ہوا۔

وطن سے محبت اور انجمن اخوان الصفا کا قیام

قصبہ رودولی ضلع بارہ بنکی ان کا آبائی وطن تھا، ان کے خاندان کے دیگر افراد یہیں آباد تھے اسی کی فضاؤں میں ان کا بچپن گزرا تھا، ابتدائی تعلیم وتربیت بھی یہیں ہوئی تھی، ظاہر ہے اس سے ان کو فطری طور پر ربط ولگاؤ تھا، حضرت شیخ احمد عبدالحق علیہ الرحمہ کے عرس اور اس کی محفل سماع میں شرکت کی یادیں رودولی کی زندگی کا ناقابل فراموش حصہ تھیں، وہ فرمایا کرتے تھے کہ "ایسی مہذب مؤدب اور باوقار محفل کہیں اور نہیں ہوتی"۔ (۱۱) اس محفل سماع میں نامی گرامی قوالوں کی نعت خوانی خاص چیز ہوا کرتی تھی جامی اور فریدالدین عطار کی نعتیں اسی محفل

سماع کی بدولت شاہ صاحب کو از بر ہو گئیں تھی اور اسی نے ان کے اندر فارسی اور اردو شعر و ادب کا پاکیزہ ذوق پیدا کیا۔

اسی زمانہ میں انھوں نے رودولی میں انجمن اخوان الصفا قائم کی جس میں قصبہ کے نوجوان اور شاہ صاحب کے احباب شریک ہوتے تھے، اخوان الصفا کا ذکر کرتے ہوئے جناب رشید نعمانی لکھتے ہیں:

> ''چاندنی راتوں اور دوسرے خوش گوار اوقات میں اس انجمن کی نشستیں ہوتی تھیں ان میں کبھی شعر و شاعری ہوتی کبھی خوش گلو قوال کی خدمات حاصل کی جاتیں، وہ فارسی اور اردو کی بہترین غزلیں سناتا، کبھی اکل وشرب کا سامان ہوتا، کبھی پکنک کے طور پر لوگ باہر نکل جاتے اور کچھ کھاتے پیتے، شاہ صاحب خود کبھی شعر خوانی میں حصہ نہیں لیتے البتہ ان کی سخن فہمی اور بذلہ سنجی لطف محفل کو دوبالا ضرور کر دیتی۔'' (۱۲)

اس انجمن کے شرکاء میں چودھری فرید الحق سابق سکریٹری سنی وقف بورڈ لکھنؤ، جناب انوار الحق نعمانی، چودھری محمد زبیر اور رشید نعمانی کے نام خاص طور سے قابل ذکر ہیں، ابتدائی دور کی ان سرگرمیوں نے شاہ صاحب کی سخن فہمی اور زبان و ادب کا ذوق اور مجلسی آداب کی آبیاری کی جس کا اثر ان کی مجلسوں اور نشستوں میں آخر تک باقی رہا، ڈاکٹر شمس تبریز خاں نے لکھا ہے کہ:

> ''ان کی مجلس علم و ادب کا زعفران زار ہوتی ان مجلسوں میں اکثر گزشتہ علماء و اکابر کے تذکرے ہوتے تھے، دوستوں کا ذکر خیر ہوتا تھا اور عزیزوں سے اظہار تعلق کیا جاتا تھا ان کا انداز بیان ایسا پر لطف ہوتا تھا گویا منھ سے پھول جھڑتے تھے، گھنٹوں بیٹھیے اور ان سے سیری نہ ہو۔'' (۱۳)

دار المصنفین آمد اور تحریر و تصنیف کا آغاز

جیسا کہ اوپر آ چکا ہے شاہ صاحب ۱۹۲۴ء میں مولانا سید سلیمان ندوی کی خواہش پر

دارالمصنفین آئے اور رفیق بنائے گئے، دارالمصنفین کی منہج تربیت کے مطابق شروع میں وہ علمی وادبی کتابوں کا مطالعہ کرتے رہے، پھر چھوٹے چھوٹے مضامین سے لکھنے کا آغاز کیا، شاہ صاحب کی اس دور کی مصروفیات کے بارے میں ان کے شریک کار اور ہمدم وہمراز جناب سید صباح الدین عبدالرحمٰن مرحوم لکھتے ہیں:

"وہ دارالمصنفین آئے تو ان کی دبی ہوئی علمی وادبی صلاحیتیں استاذی المحترم مولانا سید سلیمان ندوی کی شاگردی اور صحبت میں خوب ابھریں، حضرت سید صاحب تربیت دینے کے سلسلے میں نئے رفقا سے معارف کے لئے اخبار علمیہ لکھواتے، عربی وانگریزی جرائد کے اچھے مضامین ترجے یا تلخیص کراتے یا کتابوں پر ریویو اور تقریظ لکھنے کو کہتے، شاہ صاحب نے بھی شروع میں معارف کے لیے یہ سب کچھ کیا۔" (۱۴)

سلسلہ سیر الصحابہؓ کی تدوین میں حصہ

شاہ صاحب جس وقت دارالمصنفین آئے وہ اس کا زریں دور تھا، سید صاحب کی شخصیت آفتاب علم بنی ہوئی تھی اور وہ دارالمصنفین کی ترقی کے متعدد خطوط ومنصوبے بنا کر اپنے رفقا سے تحقیق وتصنیف کا کام لے رہے تھے اور خود بھی سیرۃ النبی کی تصنیف وتالیف میں مصروف تھے، اس وقت سیرۃ النبیؐ، سیر الصحابہؓ، تاریخ اسلام، تاریخ ہند، ناموران اسلام اور اسلامی علوم وفنون کی تاریخ وتدوین کے متعدد عظیم الشان علمی منصوبے زیر تکمیل تھے چونکہ شاہ صاحب کو تاریخ وسیر سے خاص دلچسپی تھی اس لیے سید صاحب نے انھیں سب سے پہلے سیر الصحابہ اور اس دور خیر القرون کی تاریخ کی تدوین وترتیب کا کام سپرد کیا، ان سے پہلے اس کام کا ابتدائی حصہ ان کے ہم نام مولانا حاجی معین الدین ندویؒ خلفائے راشدین کی شکل میں پیش کر چکے تھے اور مہاجرین جلد اول لکھ رہے تھے کہ کتب خانہ رام پور کی فہرست کی ترتیب کے لیے بلا لئے گئے اور یہ کام ادھورا رہ گیا، شاہ صاحب کو سلسلہ سیر الصحابہ کی تدوین کی ذمہ داری دی گئی تو سب سے پہلے انھوں نے اس ادھورے کام کو مکمل کیا پھر اس سلسلہ کی دوسری جلدیں (سوم، ششم، ہفتم)

لکھیں اور انہی کی کوششوں سے انہی کے زمانہ نظامت میں یہ مبارک سلسلہ پایۂ تکمیل کو پہنچا۔

سلسلہ تاریخ اسلام کی تدوین میں حصہ

دارالمصنفین کے پیش نظر سیرت نبوی ﷺ اور سیر الصحابہؓ کی ترتیب وتدوین کے ساتھ تاریخ اسلام کی تدوین کا بھی منصوبہ تھا، مولانا سید سلیمان ندویؒ نے اسے مشرقی اور مغربی دو حصوں میں تقسیم کر کے، مغربی ممالک اسلامیہ یعنی صقلیہ (سسلی) اور اندلس وغیرہ کی تاریخ لکھنے کی ذمہ داری مولانا سید ریاست علی ندوی کو سپرد کی جبکہ مشرقی ممالک اسلامیہ کی تاریخ کی تدوین کا کام شاہ صاحب کو سونپا، چنانچہ شاہ صاحب نے چار جلدوں میں عہد رسالت سے بنو عباس تک کی مفصل سیاسی علمی اور تمدنی تاریخ ''تاریخ اسلام'' کے نام سے لکھی، یہ کتابیں اپنے موضوع کی بہترین اور مفید ترین تاریخ قرار دی گئیں اور ان کی بڑی پذیرائی ہوئی، بعض یونیورسٹیوں کے نصابِ تعلیم میں بھی یہ شامل کی گئیں، مولانا عبدالسلام قدوائی ندوی لکھتے ہیں:

> ''اردو میں تاریخ اسلام پر بہت سی کتابیں لکھی گئی ہیں، لیکن شاہ صاحب کی کتابیں قاری کے سامنے اس عہد کی ایک واضح تصویر پیش کرتی ہیں، ان میں حکمرانوں کے حالات بھی ہیں، میدان جنگ کے واقعات بھی ہیں اور علمی، ادبی، معاشرتی مرقعے بھی ہیں، تقریباً سات سو برس کے ہنگامہ آفریں دور کے حالات کو اس طرح سمیٹ کر پڑھنے والے کے سامنے پیش کر دیا ہے کہ اسے نہ اختصار کا گلہ ہوگا اور نہ طوالت کی شکایت۔'' (۱۵)

سلسلہ تابعین اور تبع تابعین کی تدوین میں حصہ

دارالمصنفین میں تابعین کرام کے حالات وسوانح اور ان کے کارناموں کو بھی اردو زبان میں مرتب کرنے کا منصوبہ بنایا گیا تھا اس لیے کہ تابعین عظام علم وعمل اور مذہب واخلاق میں صحابہ کرامؓ کے سچے اور صحیح جانشین اور ان کے تربیت یافتہ تھے، صحابہ کرام کے بعد انھیں کا اسوہ مسلمانوں کے لیے نمونۂ عمل ہے، چنانچہ شاہ صاحب نے اس سلسلہ کا پہلا حصہ جو چھیانوے اکابر تابعین کے حالات وکارناموں پر مشتمل ہے تابعین کے نام سے لکھا ہے۔

بعد ازاں تبع تابعین کے حالات زندگی اور ان کی جلیل القدر خدمات کی تدوین کا آغاز اپنے دور نظامت میں کرایا جس کی دو جلدیں مرتب ہوئیں، پہلی جلد مولانا مجیب اللہ ندوی مرحوم اور دوسری جلد ڈاکٹر محمد نعیم صدیقی ندوی سابق رفیق دارالمصنفین نے قلم بند کی اور انہیں پر یہ سلسلہ پایہ تکمیل کو پہونچا۔

تاریخ ہند کی تدوین میں حصہ

مولانا سید سلیمان ندوی نے تاریخ ہند کی ترتیب وتدوین کا بھی ایک مکمل اور جامع خاکہ تیار کیا تھا شاہ صاحب نے اسے بھی اپنے دور نظامت میں اپنے رفقا سے دارالمصنفین کے معیار و مذاق تصنیف کے مطابق مرتب کرانے کی کوشش کی اور ہندوستان کی سیاسی وتہذیبی اور علمی وتمدنی تاریخ پر درجنوں کتابیں ان کے دور نظامت میں شائع ہوئیں، ان میں چند کے نام یہ ہیں، (۱) گجرات کی تمدنی تاریخ (۲) ہندوستان عربوں کی نظر میں (۳) تاریخ سندھ (۴) بزم مملوکیہ (۵) بزم صوفیا (۶) ہندوستان کے عہد وسطی کی ایک جھلک (۷) ہندوستان کے عہد وسطی کا فوجی نظام (۸) ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے عہد کے تمدنی جلوے (۹) ہندوستان کے سلاطین علماو مشائخ کے تعلقات پر ایک نظر (۱۰) عہد مغلیہ ہندو مسلم مورخین کی نظر میں وغیرہ، ان کتابوں پر ان کے چھوٹے چھوٹے دیباچے خود ان کے مؤرخانہ فہم وشعور کا پتہ دیتے ہیں۔

دارالمصنفین کی نظامت

جون ۱۹۴۶ء میں سید صاحب نواب حمید اللہ خاں بھوپال کے مسلسل اصرار پر بھوپال تشریف لے گئے اور وہاں ریاست کے قاضی القضاۃ اور امیر جامعہ بنائے گئے اور ۱۹۵۰ء تک اس عہدہ پر فائز رہے اس عرصہ میں گو دارالمصنفین سے ان کا برابر تعلق رہا، ماہنامہ معارف کے شذرات بھی لکھتے رہے اور خطوط کے ذریعہ دارالمصنفین کے کاموں کی دیکھ ریکھ اور اس کی نظامت کے فرائض بھی انجام دیتے رہے تاہم عملی طور پر دارالمصنفین کی تمام تر ذمہ داریاں شاہ صاحب کے کاندھوں پر تھیں جسے وہ بہ خوبی نبھاتے رہے۔ ۱۹۵۰ء میں مولانا

سید سلیمان ندوی کے پاکستان میں رک جانے کے بعد شاہ صاحب دار المصنفین کے شعبۂ علمی کے ناظم بنائے گئے تو دار المصنفین کے تمام علمی و تحقیقی منصوبوں کی تکمیل کی ذمہ داری بھی ان کے کاندھوں پر آئی اور وہ اس بار امانت کو مدۃ العمر اٹھائے رہے۔

انھوں نے جس دور میں دار المصنفین کی نظامت سنبھالی وہ ملک وملت کا نہایت پر آشوب دور تھا، آزادی کے معا بعد تقسیم وطن سے گوناگوں مسائل اٹھ کھڑے ہوئے تھے جن سے دار المصنفین بھی بہت متاثر ہوا خاص طور پر اس کی مالی و اقتصادی حیثیت ابتر ہوگئی تھی، بھوپال اور حیدر آباد کی ریاستیں جن کے تعاون سے دار المصنفین کے بیشتر کام انجام پاتے تھے ان کا وجود ختم ہو چکا تھا، ایسے پر آشوب دور میں شاہ صاحب نے انتہائی صبر و استقلال، دور اندیشی اور فہم و شعور کے ساتھ دار المصنفین کو نہ صرف باقی رکھا بلکہ علامہ شبلیؒ اور مولانا سید سلیمان ندویؒ کی اس عظیم الشان یادگار کو اور اس کے تمام علمی، تحقیقی اور تصنیفی منصوبوں کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کی ہر ممکن سعی و کوشش کی۔

علمی و تحقیقی منصوبوں پر عمل درآمد کے ساتھ کتابوں کے طبع و اشاعت کا سلسلہ بھی جاری رہا، اور متعدد کتابیں ان کے دور نظامت میں شائع ہوئیں، مولانا سید ابوالحسن علی میاں ندویؒ رقم طراز ہیں:

> ”ہندوستان کے سر پر سے تقسیم ملک کی جوئے خوں گزر گئی تھی، تصنیفی و تحقیقی اداروں کے لیے جن کی بنیاد اسلام کے خزانہ عامرہ کی حفاظت و اشاعت پر تھی اور جن کا خمیر سیرت نبوی ﷺ اور تاریخ اسلام سے اٹھایا گیا تھا زندگی کا میدان تنگ اور مستقبل تاریک سے تاریک تر نظر آرہا تھا، سیاسی اور اقتصادی انقلاب نے علمی ذوق اسلامی کتابوں کی اشاعت اور تحقیقی کام کو بے وقت کی شہنائی قرار دے دیا تھا، مسلمانوں کا جذبہ اعانت و ایثار مفلوج سا ہو گیا تھا، علمی و دینی اور خصوصیت کے ساتھ بلند پایہ تحقیقی کتابوں کی خریداری اور ایسے اداروں کی سرپرستی کا جذبہ سرد بلکہ مردہ ہوتا جا رہا تھا،

دارالمصنفین کی کتابوں کے دو مارکیٹ اور اس کے قدردانوں کے دو اہم وفعال حلقے تھے، پنجاب اور حیدرآباد، ایک اس ملک سے کٹ چکا تھا دوسرا انقلاب وحوادث کا شکار تھا ایسی حالت میں انھوں نے دارالمصنفین کی بظاہر ڈوبتی ہوئی کشتی سے اپنی قسمت اور سب صلاحیتیں وابستہ کردیں اور قلندر صفت درویش اور ایک سر پھرے ملاح کی طرح بے رم دریا کے بہاؤ کے خلاف اس کو چلانے اور ساحل مراد تک پہنچانے کا عزم کرلیا۔"(۱۶)

ماہنامہ معارف کی ادارت

مجلس دارالمصنفین کا ماہوار علمی رسالہ معارف جو اردو کا سب سے زیادہ بلند پایہ اور معیاری رسالہ تھا اور آج بھی ہے جس کے بارے میں علامہ اقبال نے لکھا تھا کہ یہی ایک رسالہ ہے جس کے پڑھنے سے حرارت ایمانی میں ترقی ہوتی ہے۔(۱۷) سید صاحب کے بعد جب اس کی ادارت کی ذمہ داری شاہ صاحب نے سنبھالی تو انھوں نے اس کے بلند علمی و تحقیقی معیار اور وقار کو ذرا بھی نیچے نہ آنے دیا، ابوعلی اثری مرحوم لکھتے ہیں:

"انھوں نے سید صاحب علیہ الرحمہ کی ساری روایات کو اور معارف کے علمی معیار اور اس کے اسلوب کو قائم رکھا اور اس میں کوئی فرق نہیں آنے دیا یہ ان کی زندگی کا ایک بڑا کارنامہ ہے۔"(۱۸)

معارف کے شذرات یعنی ادارتی تحریر میں ملک وملت کے مختلف مسائل پر تبصرہ کیا جاتا ہے، حقیقت واضح کی جاتی ہے اور غلط نقطۂ نظر پر تنقید کر کے اصلیت کو نمایاں کیا جاتا ہے۔ آج ان شذرات کی حیثیت تاریخ کے ایک بنیادی ماخذ کی ہے، شاہ صاحب نے تقریباً تیس برس تک اس طرح کے شذرات لکھے کہ شذرات سلیمانی کی شوکت وحشمت ان شاہی شذرات میں بھی ماضی کے آن بان کے ساتھ قائم رہی، ڈاکٹر شعیب اعظمی لکھتے ہیں:

"جن لوگوں نے معارف کا مطالعہ کیا ہے وہ اس بات کی گواہی دے سکتے ہیں کہ شذرات کا معیار بلند ہوتا گیا، ملک وقوم کی مشکل ہو، ادبی

اور علمی الجھن ہو، شخصیات ہوں، یا عوام کی بات ہو، شذرات میں ہمیں شاہ صاحب کی مقتدر سنجیدہ اور صائب رائے نظر آئی، یہ شاہ صاحب کی ذات تھی جنہوں نے تقسیم کے بعد ملک کی مسموم فضا میں اپنے قلم کو وہ احتیاط بخشی جس سے کبھی نہ تو مسلمانوں کے مسائل سے بے اعتنائی ہوئی اور دوسری طرف ارباب حکومت کی نظروں میں شکوک نہ ہوا۔'' (۱۹)

خود سید صاحب نے بھی شاہ صاحب کے شذرات پر اپنی طمانیت کا اظہار کیا، ان کو ایک خط میں لکھا کہ ''معارف میں آپ کے شذرات پڑھے الحمد اللہ آپ نے شذرات کے وقار کو قائم رکھا، س (سید سلیمان ندوی) اور م (معین الدین) میں شاید ہی کسی کو فرق محسوس ہو۔'' (۲۰)

ان شذرات کی حیثیت تاریخ کے بنیادی ماخذ کی ہے جب کبھی مورخ ہندوستان کے مسلمانوں کی تاریخ قلم بند کرے گا تو وہ شاہ صاحب کے ان شذرات سے صرف نظر نہ کر سکے گا، دارالمصنفین نے مولانا سید سلیمان ندوی کے شذرات کو تین جلدوں میں شذرات سلیمانی کے نام سے اشاریے کے ساتھ شائع کر دیا ہے، شاہ صاحب کے شذرات کی افادیت کم نہیں، ضرورت ہے کہ ان کے شذرات بھی اسی انداز میں شائع کر دیے جائیں۔

شذرات ہی کے ضمن میں شاہ صاحب نے متعدد اہل علم وقلم کے سانحہ وفات پر نقوش غم ابھارے ہیں، انھیں بھی یاد رفتگاں اور بزم رفتگاں کی طرح شائع کیا جا سکتا ہے۔

مولانا سید سلیمان ندوی سے عقیدت

شاہ صاحب مولانا سید سلیمان ندوی کی خواہش پر دارالمصنفین آئے ان ہی کے زیر سایہ تصنیف وتالیف کی تربیت پائی، انھیں کی سرپرستی میں ۲۵ برس تک تصنیف وتالیف کا کام انجام دیا اس لیے ان کو سید صاحب کی ذات گرامی سے والہانہ تعلق تھا بقول مولانا عبدالسلام قدوائی ''سید صاحب کو وہ ایک شفیق باپ، مہربان استاذ اور روشن ضمیر مرشد کی طرح سمجھتے اور اپنی ساری صلاحیتوں کو ان کا فیض اور ان کی عنایت کا اثر'' تسلیم کرتے تھے۔ (۲۱)

سید صاحب کو بھی شاہ صاحب سے بڑی محبت تھی وہ ان کو اپنا جانشین تصور کرتے تھے، ایک خط میں لکھتے ہیں:

''معارف میں آپ اپنے جدید نظام کا ذکر جس طرح چاہیں کریں، آپ کے ہونے کو میں اپنا ہی ہونا سمجھتا ہوں اور مجھ کو آپ کی قائم مقامی سے ویسی ہی مسرت اور طمانیت ہے جو کسی روحانی و جسمانی خلف الصدق کی جانشینی سے ہوسکتی ہے، خدا کا شکر ہے میں نے اپنی زندگی ہی میں اپنی موت کے بعد کے دارالمصنفین کا نقشہ دیکھ لیا۔'' (۲۲)

رفقا کی اصلاح و تربیت

دارالمصنفین کا بنیادی مقصد علماء کا ایک ایسا گروہ پیدا کرنا ہے جو عصری تقاضوں سے باخبر ہو کر اسلام کی خدمت کر سکے علامہ شبلی نعمانی علیہ الرحمہ نے اسی مقصد کے تحت دارالمصنفین کا خاکہ ومنصوبہ بنایا تھا، مولانا سید سلیمان ندوی جب تک دارالمصنفین میں رہے یہ بنیادی مقصد ان کے پیش نظر رہا، انھوں نے متعدد فضلاء ورفقا کی تربیت کی جو علمی دنیا میں بہترین مصنف اور اہل قلم ثابت ہوئے۔

شاہ صاحب نے جب دارالمصنفین کی نظامت سنبھالی تو سید صاحب نے اس خاص امر کی طرف ان کی توجہ مبذول کرائی اور ایک خط میں لکھا کہ:

''اب آپ جہاں تک ہوسکے دین وملت کی خدمت سمجھ کر اس کام کو انجام دیں اور ساتھ ہی اپنے رفقا کی تیاری میں مصروف رہیں تاکہ چراغ سے دوسرا چراغ یوں ہی جلتا رہے اور استاذ مرحوم کا سلسلہ قائم رہے۔'' (۲۳)

شاہ صاحب نے دارالمصنفین کے اس اہم فریضہ کی انجام دہی میں اپنے مربی و مرشد کی اس ہدایت کو ہمیشہ پیش نظر رکھا، دارالمصنفین کے نئے رفقا کی تربیت واصلاح کی ذمہ داری انھوں نے جس حسن وخوبی سے انجام دی اس کے متعلق بھی کہا جاسکتا ہے کہ وہ اس میں بھی سید صاحب کے صحیح جانشین ثابت ہوئے۔

مختصر یہ کہ شاہ صاحب نے حتی الامکان دارالمصنفین کے علمی و تحقیقی وقار و معیار کو صرف باقی ہی نہیں رکھا بلکہ اسے اوج کمال پر پہنچانے کی کامیاب کوشش بھی کی، یہ ان کی کتاب زندگی کا ایک روشن ترین باب ہے۔

دارالمصنفین سے تعلق

شاہ صاحب نصف صدی تک دارالمصنفین سے وابستہ رہے یہ طویل مدت ظاہر ہے نشیب و فراز سے خالی نہیں ہو سکتی تاہم شاہ صاحب کے پائے استقامت میں کبھی جنبش نہیں آئی، انھوں نے علامہ شبلی اور سید صاحب کی یادگار دارالمصنفین کی خدمت کو دنیا کی سب سے بڑی دولت سمجھا، مولانا عبدالسلام قدوائی لکھتے ہیں:

> ''وہ پورے پچاس سال استاذ اور مربی کے آستانہ پر جمے رہے نہ مشکلات اور پریشانیاں کبھی ان کو ہراساں کر سکیں اور نہ راحت و آرام اور نہ عزت و وقار کے دلکش مواقع نے ان کے پائے استقلال میں لغزش پیدا کی وہ حسرت اور تنگ دستی اور مشکلات و مصائب سے بے خوف اور ترغیب و تحریص سے بے نیاز ہو کر استاذ کی ہدایت کی تعمیل میں لگے رہے اور شبلی و سلیمان کے لگائے ہوئے پودے کو اپنے خون جگر سے سینچتے رہے تا آنکہ راہ وفا کے مسافر کو موت نے ابد کی خواب گاہ میں پہنچا دیا۔'' (۲۴)

شاہ صاحب مختلف علمی و تعلیمی اداروں کے ممبر رہے مسلم یونیورسٹی کورٹ کے بھی ممبر تھے، ہندوستان کا ہر طبقہ ان کے علم و فضل سے بہ خوبی واقف تھا، دنیاوی لحاظ سے اچھے سے اچھے عہدے ان کے لئے کم نہیں تھے لیکن دارالمصنفین کے عشق نے ان کو کسی اور آستانہ کی جانب نظر اٹھانے کی فرصت نہ دی، مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ لکھتے ہیں:

> ''دارالمصنفین سے تعلق پیدا ہونے کے بعد انھوں نے کسی اور آستانہ کی طرف نظر اٹھا کر نہ دیکھا...... ان کے لئے کسی بڑی سے بڑی یونیورسٹی میں شعبۂ اردو یا شعبۂ اسلامیات میں اونچی سے اونچی جگہ حاصل کرنا

نہ صرف آسان تھا بلکہ اس دانش گاہ کے لئے سرمایہ افتخار تھا، لیکن انھوں نے ان چیزوں کو کبھی درخور اعتنا نہ سمجھا...... اس طرح وہ دارالمصنفین کشتیاں جلا کر آئے تھے اور اپنی پوری زندگی اور سب صلاحیتیں اس کی نذر کر دیں۔'' (۲۵)

ان کے دوست اور نامور مصنف و اہل قلم مولانا سعید احمد اکبرآبادی مدیر برہان دہلی نے ایک موقع پر کلکتہ میں تاریخ اسلام کی پروفیسری کے لیے اصرار کیا مگر انھوں نے صاف انکار کر دیا، ان کے اس پرعزم فیصلے سے سید صاحب بھی خوش ہوئے اور ایک خط میں لکھا کہ:

''آپ نے کلکتہ نہ جانے کا جو عزم ظاہر کیا اس سے دل بہت خوش ہوا حقیقت یہ ہے کہ اس عمر میں جب قوی مضمحل ہو رہے ہوں خلف رشید کی طلب بہت بڑھ جاتی ہے اور اب وہ کیفیت سمجھ میں آتی ہے جو مولانا شبلی مرحوم اور حمید الدین مرحوم کی دیکھی تھی کہ بعد کے کام کے لئے صحیح جانشین کا تصور ان پر بہت غالب تھا، اللہ تعالی آپ لوگوں کے ایثار کو قبول فرمائے اور بیش از بیش برکت عطا فرمائے۔'' (۲۶)

جناب سید صباح الدین عبدالرحمن مرحوم نے لکھا ہے کہ مدرسہ عالیہ کلکتہ اور جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی سے ان کو خاطر خواہ تنخواہوں پر مدعو کیا گیا لیکن انہوں نے دارالمصنفین کی خدمت ہی کو اپنی زندگی کا اصلی مقصد قرار دیا۔ (۲۷)

ایک بار حکومت ہند کے چند نمائندے شاہ صاحب کے پاس یہ پیش کش لے کر آئے کہ دارالمصنفین کو سرکاری سرپرستی میں دے دیا جائے تا کہ اس کی مالی حالت کو بہتر بنایا جا سکے مگر انھوں نے اس ادارے کو ملت کی سرپرستی میں رکھنا پسند کیا اور یہ پیش کش مسترد کر دی۔ (۲۸)

ظاہر ہے سرکاری سرپرستی کے بعد دارالمصنفین کے بنیادی مقاصد کے حصول و حفاظت کی راہ میں ان عوارض وموانع کا خدشہ بڑھ جاتا جن سے اصل مقاصد ہی فوت ہو جاتے اور یہ عمل بانیین کے لیے تکلیف دہ ثابت ہوتا، غالباً اسی بنا پر شاہ صاحب نے اس بڑی پیش کش کو نامنظور کر دیا۔

دار المصنفین کی گولڈن جبلی

شاہ صاحب کے زمانہ نظامت ۱۹۶۵ء میں دار المصنفین کی گولڈن جبلی منائی گئی جس کی صدارت ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صدر جمہوریہ ہند نے کی، یہ اپنے نوع کی ایک مختلف گولڈن جبلی تھی، اسی موقع پر ڈاکٹر ذاکر حسین نے اپنا وہ قیمتی صدارتی خطبہ دیا تھا جس سے دار المصنفین، علم اور اہل علم سے ان کے ربط و تعلق کا نہ صرف اندازہ ہوا بلکہ اس سے دار المصنفین کی عظیم الشان علمی خدمات سے ان کی گہری واقفیت کا بھی پتہ چلا، یہ گولڈن جبلی شاہ صاحب ہی کی کوششوں سے نمود و نمائش کے بجائے ایک خالص علمی مجلس ہوگئی تھی۔

مختلف تنظیموں سے تعلق اور علمی و تعلیمی اسفار

شاہ صاحب اپنے علم و فضل، علمی مقام و مرتبہ اور دار المصنفین کی نظامت کی وجہ سے ملک کے متعدد علمی و تعلیمی اداروں اور تنظیموں کے رکن تھے، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے کورٹ ممبر ہونے کی وجہ سے اس کی میٹنگوں میں پابندی سے شریک ہوکر مفید مشورے دیتے، جب بھی علی گڑھ جاتے دار المصنفین کے سابق رفیق ڈاکٹر محمد عزیر لکچرر شعبہ اردو مصنف تاریخ دولت عثمانیہ کے یہاں ٹھہرتے۔

وہ قاضی محمد عدیل عباسی کی انجمن تعلیمات دین کے بھی ایک ممتاز رکن تھے اس کے بنارس کے اجلاس میں شریک ہوئے۔ اس کے علاوہ انجمن ترقی اردو ہند، ہندوستانی اکیڈمی الہ آباد، اردو اکادمی لکھنؤ اور جامعہ اردو علی گڑھ کے بھی وہ رکن رہے۔

شاہ صاحب نے متعدد علمی و ادبی سمیناروں میں شرکت کی اور مقالات بھی پڑھے ان کا مشہور مقالہ ''اردو شاعری میں ہندو کلچر اور ہندوستان کے طبعی و جغرافیائی اثرات'' ہندوستانی اکیڈمی کی فرمائش پر الہ آباد میں پیش کیا گیا۔ اسی طرح لکھنؤ یونیورسٹی کی اورینٹل کانفرنس میں ''اردو زبان کی لسانی علمی اور تمدنی حیثیت'' جیسا پر مغز اور محققانہ مقالہ پڑھا جو بے حد پسند کیا گیا۔

سفر حج

شاہ صاحب کو دوبار فریضہ حج ادا کرنے کی سعادت ملی، پہلی بار ۱۹۶۶ء میں اور دوسری بار ۱۹۷۴ء میں حکومت سعودیہ کی وزارت اطلاعات کی دعوت پر انہوں نے حج کیا۔ ان کی روداد بھی معارف میں لکھی جو میرا سفرحج کے عنوان سے جولائی تا ستمبر ۱۹۶۶ء کے شماروں میں دیکھی جاسکتی ہیں۔اس سفرنامہ کو علاحدہ کتابی شکل میں اگر شائع کیا جائے تو مفید اور مقبول سفرنامہ ثابت ہوگا۔

اعزاز

شاہ صاحب کی علمی وادبی خدمات کا اعتراف اہل علم کے علاوہ اربابِ حکومت نے بھی کیا، ۱۹۷۰ء میں حکومت ہند نے انہیں صدر جمہوریہ ایوارڈ برائے عربی خدمات عطا کیا، اس اعزاز پر ان کے احباب و معاصرین کی تہنیت، مبارک باد کے علاوہ اس وقت کی ملک کی وزیراعظم آنجہانی مسز اندرا گاندھی نے بھی انہیں ذاتی طور پر مبارک باد کا خط لکھا۔(۲۹)

شرافت اور حسن اخلاق

شاہ صاحب شرافت اور حسن اخلاق کا نمونہ تھے، انکسار، فروتنی، مروت ومحبت اور صبر وشکر جیسے اوصاف کے وہ گویا مجسمہ تھے، مولانا ضیاء الدین اصلاحی صاحب ناظم دارالمصنفین لکھتے ہیں:

> ”وہ نہایت شریف النفس، پاک طینت اور بڑے ستودہ صفات تھے۔ان کی زندگی سادہ درویشانہ اور تکلفات سے بری تھی، موجودہ دور کی دلفریبیوں اور نئے تمدن کی ظاہری چمک دمک کا ان پر کوئی اثر نہ تھا، نرمی و مروت اور دل اخلاص ومحبت کا ایسا آئینہ تھا جو نفاق، بناوٹ، تصنع، رشک و حسد اور کینہ وکدورت کے گردوغبار سے یکسر پاک تھا۔
>
> ان کی اکثر ادائیں معصومانہ اور زندگی بڑی پاکیزہ اور بے داغ تھی، معصیت اور فجور کا ارتکاب تو درکنار اس کا تصور اور خیال بھی دل میں نہ آیا ہوگا، تہذیب وشائستگی اور وقار ومتانت کے خلاف کوئی بات نہیں کرتے

تھے..... ان کی کسی ادا سے رعونت اور نخوت کا اظہار نہ ہوتا تھا، وضع قطع، چال ڈھال، رفتار و گفتار ہر چیز سے انکسار اور فروتنی کا پتہ چلتا تھا ان میں خودستائی بالکل ہی نہ تھی، میں نے کبھی ان سے تعریف و توصیف اور عظمت و بڑائی کا ایک کلمہ بھی نہیں سنا۔" (۳۰)

اس سلسلہ میں دارالمصنفین کے ایک قدیم کارکن جناب ابوعلی اثری مرحوم کی شہادت بھی ملاحظہ ہو، وہ لکھتے ہیں:

"ان کو اپنی بڑائی کا، اپنی عظمت کا، موجودہ دور میں اردو کے ایک عظیم مصنف ہونے کا، شبلی وسلیمان کے جانشین ہونے کا، معارف جیسے وقیع علمی رسالہ کے ایڈیٹر ہونے کا، دارالمصنفین جیسے عالمی شہرت رکھنے والے ادارہ کے ناظم اعلیٰ ہونے کا ذرا بھی احساس نہیں تھا، باہر جاتے تھے تو اس کا کسی ادا سے اظہار نہیں ہونے پاتا تھا۔" (۳۱)

استغنا و بے نیازی

شاہ صاحب کی شخصیت میں استغناء و بے نیازی کی خوبی اس درجہ تھی کہ اس کا ذکر خاص طور پر کیا جانا چاہیے، اگر یہ کہا جائے کہ یہ وصف ان میں موروثی تھا تو بے جا نہ ہوگا انھیں مال و دولت اور جاہ و منصب کی حرص و ہوس تو کیا خواہش بھی ذرہ برابر نہ تھی۔

مدرسہ عالیہ کلکتہ اور جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی سے مناصب کی پیشکش کا ذکر اوپر ہو چکا ہے ان کے نزدیک یہ سب چیزیں درخور اعتنا نہ تھیں، مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ لکھتے ہیں:

"انھوں نے نہ کوئی جائداد بنائی، نہ سرمایہ جمع کیا، نہ اپنے آبائی مکان جو رودولی میں تھا کی فکر کی، وہ وہاں بھی مہمان کی طرح جاتے اور چلے آتے، ان کا اصل نشیمن اور ان کے ذوق وروح کا مسکن دارالمصنفین ہی تھا، اس طرح ان میں فقر و استغنا کی وہ شان تھی جو ان کے آبائے کرام کا شیوہ تھا۔" (۳۲)

وہ جب دارالمصنفین آئے تو ان کا مشاہرہ محض ۲۵ روپیہ تھا جو نصف صدی گزرنے

کے بعد صرف چار سو روپیہ تک پہونچا تھا، وہ اس ادارہ کے ناظم وسربراہ تھے مگر انھوں نے کبھی اپنی تنخواہ میں اضافہ کی خواہش بھی نہیں کی اور جو کچھ ملتا تھا اسے اپنے لیے کافی سمجھتے رہے۔(۳۳)

رودولی میں ان کی اپنی بڑی جائداد تھی جسے برادر اصغر شاہ امام احمد کے حوالہ کردیا اور پھر پوری زندگی اس کی طرف نظر بھی نہیں کی۔

وسیع المشربی

شاہ صاحب میں وسعت قلبی وفراخ دلی اور مروت ورواداری کی خوبیاں اس طرح راسخ تھیں کہ عصبیت اور تنگ نظری کے لیے کوئی جگہ ہی نہیں تھی بقول مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی مرحوم ''وہ ایسی مٹی سے بنے تھے جس میں غبار کا نام نہیں تھا'' (۳۴) وہ بلا امتیاز مذہب وملت اور مسلک وموقف اچھے کاموں کی داد دیتے، دبستان شبلی کے علاوہ دوسرے حلقوں کے شعراو ادبا میں اگر کوئی اوصاف دکھائی دیتا تو وہ اس کی ضرور پذیرائی کرتے، اس ضمن میں ان کے ایک واقعے کا ذکر جناب رشید نعمانی نے ان الفاظ میں کیا ہے:

> ''رودولی میں ایک شیعہ بزرگ چودھری محمد علی مرحوم ابھی حال تک زندہ تھے، قصبہ کے بہت بڑے رئیس اور تمام رئیسانہ خصوصیات کے حامل تھے...... شاہ صاحب ایک خورد کی حیثیت سے ان کی مزاج پرسی کو جایا کرتے تھے، وہ شاہ صاحب کے علم وفضل کے بڑے قدرداں تھے اور نماز روزہ وعبادت اور رواداری کے موضوع پر شاہ صاحب سے دیر تک گفتگو کرتے رہتے تھے، اس دوران وہ اپنے مخصوص عقائد پر زور دیتے، شاہ صاحب ادب ومتانت سے ان کا جواب دیتے لیکن کبھی مناظرانہ رنگ پیدا نہ ہونے دیتے۔ چودھری صاحب مرحوم رواداری کے طور پر شیعہ اور سنی حضرات کو ایک دوسرے کی امامت میں نماز ادا کرنے کی تلقین کرتے تھے اس سلسلہ میں ان کی دلی خواہش پر کبھی کبھی شاہ صاحب ان کے ساتھ عصر یا مغرب کی نماز میں شریک ہولیا کرتے تھے، حج سے واپسی پر چودھری صاحب مرحوم اپنے اکثر غیر مذہبی مشاغل وافکار سے تائب اور دست کش

ہو گئے تھے۔‘‘(۳۵)

اسی طرح انہوں نے شذرات میں ہر طرح کے کاموں اور اور ہر طرح کے لوگوں کا ذکر بلالحاظ مذہب وملت کیا ہے، ۱۹۷۰ء میں شیعوں کے مجتہد اعظم سید محسن الحکیم نے وفات پائی تو ان کا ذکر بڑے اہتمام سے کیا، ان کی وسیع المشربی کا یہ حال تھا کہ وہ شیعوں میں رائج منصب مجتہد کو اچھا خیال کرتے تھے حالانکہ وہ سنی تھے جن کے یہاں اس کا تصور بھی نہیں ملتا لیکن وہ بعض مصالح کی بنیاد پر اسے مفید خیال کرتے تھے، وہ لکھتے ہیں:

’’سنیوں کے یہاں اس قسم کا کوئی منصب نہیں جو پوری سنی دنیا ماننے پر مجبور ہو، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ان میں ہر شخص مجتہد ہے اور جن کو نہ صرف دینی علوم سے واقفیت نہیں بلکہ مذہب سے بھی عملاً کوئی علاقہ نہیں ان کو بھی اجتہاد کا دعویٰ ہے، چنانچہ آج کل ایسے بہت سے مجتہد اور مفسر قرآن ملیں گے جو عربی کے ابجد سے بھی واقف نہیں، ان کا کام یہ ہے کہ جو نیا قالب نظر آئے اس کو اسلام میں ڈھالنے کی کوشش کریں ان کے اجتہاد کے عجیب و غریب نمونے آئے دن نظر آتے رہتے ہیں اور اس تخریب کا نام انہوں نے اسلامی خدمت رکھا ہے، شیعوں کے نظام میں اگرچہ تنگی ہے لیکن مذہبی ضبط و نظام کے نقطۂ نظر سے، بہت مفید ہے۔‘‘(۳۶)

تصوف وسلوک

شاہ صاحب ایسے خانوادے کے فرد فرید تھے جو تصوف وسلوک کا گہوارہ تھا جس کا پورا ماحول تصوف وسلوک کے رنگ سے نکھرا ہوا تھا، شاہ صاحب کو فطری طور پر اس سے لگاؤ تھا خود شاہ صاحب مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

’’میں لاکھ بے عمل سہی لیکن الحمد للہ بے عقیدہ نہیں، دل میں ایمان کی چنگاری موجود ہے جب کوئی شعاع پڑتی ہے تو اس میں گرمی پیدا ہو جاتی ہے میری طبیعت کو فطرتاً جمال اور عشق ومحبت سے زیادہ مناسبت ہے اس لیے خشک کتابوں کا زیادہ اثر نہیں ہوتا مگر جب عشق ومحبت اور کیف ومستی

کا کوئی نغمہ کانوں میں پڑتا ہے تو دل کی کیفیت بدل جاتی ہے۔" (۳۷)

لیکن شاہ صاحب کی خالص علمی وتحقیقی زندگی نے ان کے رنگِ تصوف کو زیادہ کھلنے اور ظاہر ہونے کا موقع نہیں دیا۔ آخر وقت میں مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی معیت میں سہارن پور کا سفر کیا اور شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا صاحبؒ سے بیعت وارادت حاصل کی، مولانا سہارن پوری سے یہ تعلق بڑا مستحکم ثابت ہوا۔

تصوف وسلوک سے اس قدر دلچسپی کے باوجود اس کے بعض مروجہ رسم ورواج کو وہ پسند نہیں کرتے تھے، چنانچہ رودولی میں حضرت شیخ احمد عبدالحق علیہ الرحمہ کے مزار پر بعض غیر شرعی رسم ورواج کی اصلاح کا فریضہ بھی انھوں نے انجام دیا، شاہ آفاق احمد رودولوی سجادہ نشیں کا بھی اس اصلاح میں بڑا دخل تھا۔ (۳۸)

شاہ صاحب کی ان تمام اصلاحات پر عرصے تک عمل ہوتا رہا، مگر موجودہ نظام نے قدیم روایتوں کو بھی پھر سے شروع کر دیا ہے، ان کا خیال ہے کہ اس سے خانوادے کو بڑا نقصان پہونچ رہا ہے۔

حلیہ

شاہ صاحب نہایت وجیہ وشکیل تھے، چہرہ پر رونق، بدن فربہ اور رنگ سرخ وسفید تھا، اپنے استاذ مولانا سید سلیمان ندوی سے بڑے مماثل تھے، علی گڑھ میں پروفیسر خلیق احمد نظامی مرحوم نے پہلی بار جب ان کو دیکھا تو کہا کہ کہیں میں مولانا سید سلیمان ندوی کو تو نہیں دیکھ رہا ہوں، ابوعلی اثری لکھتے ہیں:

> "سید صاحب کے پورے مثیل تھے، سید صاحب کی طرح شکل وجیہ، چہرہ باوقار اور داڑھی بہت پرنور تھی اور جامہ زیبی تو ان پر ختم تھی وہ جب پہن اوڑھ کر باہر نکلتے تھے تو ان کو دیکھ کر حضرت سعدی کا یہ شعر زبان پر آجاتا تھا۔

اے تماشا گاہ علم روئے تو
تو کجا بہر تماشا می روی (۳۹)

وفات

شاہ صاحب نے دارالمصنفین کی خدمت کرتے ہوئے اس کے احاطہ میں ۲۸ ذی قعدہ ۱۳۱۴ھ مطابق ۱۳ر دسمبر ۱۹۷۴ء بروز جمعہ دار فانی کو خیر باد کہا اور اپنے مالک حقیقی سے جا ملے۔ انا للہ و انا الیہ راجعون.

۱۴ر دسمبر کو ان کی خواہش کے مطابق رودولی میں ان کے آبائی قبرستان میں سپرد خاک کیا گیا، ان کی وفات کی خبر سے اہل علم کو بڑا صدمہ پہنچا، متعدد اہل قلم نے ان کی وفات پر غم انگیز مضامین لکھے اور ان کی وفات کو ایسا خلا بتایا جس کا پر ہونا ناممکن قرار دیا، شاعروں نے دل دوز مرثیے لکھے، مولانا محمد عثمان قاسمی جون پوری جن کو شاہ صاحب سے بڑا تعلق تھا ان کے مرثیہ کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

دارالمصنفین کا سلطاں چلا گیا
علم و ادب کا نیر تاباں چلا گیا

تصنیف کا امام قلم کا وہ شہ سوار
صد حیف جانشینِ سلیماں چلا گیا

دانش کدے میں نور تھا اس کے وجود سے
فہم و خرد کا مہر درخشاں چلا گیا

خاموش عندلیب ہے پژمردہ پھول ہیں
یہ کون آہ جان بہاراں چلا گیا

وہ سادگی وہ شان تواضع بایں کمال
انسانیت ملول ہے انساں چلا گیا

وہ دین معین و ملت کا پاسباں
افسوس ایک فاضل ذی شاں چلا گیا

☆☆☆

(باب دوم)

تصنیفات

شاہ صاحب ادیب بھی تھے انشا پرداز بھی، تذکرہ نگار بھی تھے مؤرخ بھی، شعر وشاعری کے رمز شناس اور نکتہ سنج بھی، ان خصوصیات نے ان کی تصنیفات میں بھی بڑا تنوع پیدا کر دیا ہے۔

جیسا کہ گزشتہ صفحات میں لکھا جا چکا ہے وہ مدۃ العمر تحقیق وتصنیف میں منہمک رہے اور ایک درجن سے زائد کتابیں اور سیکڑوں علمی وادبی، تحقیقی اور تنقیدی مقالات سپردِ قلم کئے۔ دو کتابوں کا ترجمہ بھی کیا، ان کی تصنیفات، تالیفات اور تراجم کے نام یہ ہیں:

(۱۔۳) سیر الصحابہ جلد سوم، ششم، ہفتم (۴) عرب کی موجودہ حکومتیں (۵۔۸) تاریخ اسلام جلد اول تا چہارم (۹) تابعین (۱۰) ادبی نقوش (۱۱) دین رحمت (۱۲) حیاتِ سلیمان (۱۳) انوار العیون فی اسرار المکنون (۱۵) اسلام اور عربی تمدن۔

یہاں ان بیش قیمت تصانیف کا ایک تعارف پیش کیا جاتا ہے۔

(۱) سیر الصحابہ (جلد سوم)

یہ شاہ صاحب کی پہلی تصنیف اور دار المصنفین کے سلسلہ سیر الصحابہ کی تیسری جلد ہے اس سے پہلے سیر الصحابہؓ کی پہلی اور دوسری جلد مولانا حاجی معین الدین ندوی کے قلم سے خلفائے راشدین اور مہاجرین جلد اول کے نام سے شائع ہو چکی تھیں۔ مہاجرین جلد اول حاجی صاحب موصوف نامکمل چھوڑ گئے تھے شاہ صاحب نے اسے دو اہم مضامین اور پر مغز علمی مقدمہ

(۲۳) ایضاً ص ۵۹۱
(۲۴) تعمیر حیات لکھنؤ (مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی نمبر) ص ۹
(۲۵) پرانے چراغ حصہ اول ص ۴۵۵۔۴۵۶
(۲۶) ماہنامہ معارف اعظم گڑھ، شذرات فروری ۱۹۵۷ء
(۲۷) تعمیر حیات لکھنؤ (شاہ معین الدین احمد ندوی نمبر) ص ۱۲
(۲۸) تعمیر حیات لکھنؤ (شاہ معین الدین احمد ندوی نمبر) ص ۱۲
(۲۹) ذکر رفتگاں ص ۹۱
(۳۰) تعمیر حیات (شاہ معین الدین احمد ندوی نمبر) ص ۱۵
(۳۱) ایضاً ص ۲۲
(۳۲) پرانے چراغ حصہ اول ص ۴۵۵۔۴۵۶
(۳۳) ایضاً ص ۴۵۶
(۳۴) ماہنامہ معارف جنوری ۱۹۷۵ء، ص ۶۰
(۳۵) تعمیر حیات (شاہ معین الدین احمد ندوی نمبر) ص ۱۷
(۳۶) شذرات، معارف جون ۱۹۷۰ء، ص ۴۰۴
(۳۷) پرانے چراغ حصہ اول ص ۴۴۹۔۴۵۰
(۳۸) ایضاً ص ۴۵۳۔۴۵۴
(۳۹) تعمیر حیات لکھنؤ (شاہ معین الدین احمد ندوی نمبر) مارچ اپریل ۱۹۷۵ء، ص ۲۴



(باب دوم)

تصنیفات

شاہ صاحب ادیب بھی تھے انشا پرداز بھی، تذکرہ نگار بھی تھے مؤرخ بھی، شعر وشاعری کے رمز شناس اور نکتہ سنج بھی، ان خصوصیات نے ان کی تصنیفات میں بھی بڑا تنوع پیدا کر دیا ہے۔

جیسا کہ گزشتہ صفحات میں لکھا جا چکا ہے وہ مدۃ العمر تحقیق وتصنیف میں منہمک رہے اور ایک درجن سے زائد کتابیں اور سیکڑوں علمی وادبی، تحقیقی اور تنقیدی مقالات سپردِ قلم کئے۔ دو کتابوں کا ترجمہ بھی کیا، ان کی تصنیفات، تالیفات اور تراجم کے نام یہ ہیں:

(۱۔۳) سیر الصحابہ جلد سوم، ششم، ہفتم (۴) عرب کی موجودہ حکومتیں (۵۔۸) تاریخ اسلام جلد اول تا چہارم (۹) تابعین (۱۰) ادبی نقوش (۱۱) دین رحمت (۱۲) حیاتِ سلیمان (۱۳) انوار العیون فی اسرار المکنون (۱۵) اسلام اور عربی تمدن۔

یہاں ان بیش قیمت تصانیف کا ایک تعارف پیش کیا جاتا ہے۔

(۱) سیر الصحابہ (جلد سوم)

یہ شاہ صاحب کی پہلی تصنیف اور دار المصنفین کے سلسلہ سیر الصحابہ کی تیسری جلد ہے اس سے پہلے سیر الصحابہؓ کی پہلی اور دوسری جلد مولانا حاجی معین الدین ندوی کے قلم سے خلفائے راشدین اور مہاجرین جلد اول کے نام سے شائع ہو چکی تھیں۔ مہاجرین جلد اول حاجی صاحب موصوف نامکمل چھوڑ گئے تھے شاہ صاحب نے اسے دو اہم مضامین اور پر مغز علمی مقدمہ

لکھ کر مکمل کیا اس کے بعد یہ حصہ سپرد قلم کیا۔

اس میں ۱۰۱ مہاجر صحابہ کرامؓ کے حالات وسوانح اور ان کی مذہبی وسیاسی خدمات کا مرقع مستند ماخذوں سے پیش کیا گیا ہے جو فتح مکہ سے پہلے مشرب بہ اسلام ہوئے اور ہجرت کی، صحابہ کرام کے حالات وسوانح کے ساتھ اس عہد کے بعض ملکی وسیاسی کارنامے اور تمدنی ترقیات کے واقعات بھی اس میں آگئے ہیں، جس سے یہ کتاب تاریخ وتذکرہ کا دلکش نمونہ بن گئی ہے، جناب سید صباح الدین عبدالرحمٰن لکھتے ہیں:

> ”شاہ صاحب نے ان (صحابہ کرامؓ) کے حالات ایسے انداز میں پیش کیے ہیں کہ ان کو پڑھتے وقت ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہم بہت سے دلآویز مضامین کا ایک مجموعہ پڑھ رہے ہیں، یہ شاہ صاحب کے انداز تحریر کی خوبی ہے جو دبستان شبلی کے عین مطابق ہے، شروع سے آخر تک انداز بیان میں ادب، احترام اور وزن قائم رکھنے کا اہتمام ہے جس سے تحریر میں تاثیر پیدا ہوگئی ہے۔“(۱)

یوں تو شاہ صاحب کا اشہب قلم تمام ہی صحابہ کرامؓ کے تذکرے میں رواں دواں اور تاثیر ودلکشی اور دلآویزی کا نمونہ ہے تاہم حضرت خالد بن ولیدؓ کے ذکر میں وہ کچھ اور ہی جاذب، دلکش اور خوب صورت ہوگیا ہے، ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

> ”حضرت خالدؓ بن ولید کو ذوق جہاد اور راہ خدا میں سر وبال دوش بنانے میں دربار رسالت سے سیف اللہ کا لقب ملا، تقریباً سوا سو لڑائیوں میں اپنی تلوار کے جوہر دکھائے، جسم میں ایک بالشت حصہ بھی ایسا نہ تھا جو تیروں اور تلواروں کے زخم سے چھلنی نہ ہوا ہو، اکثر ذوق جہاد میں کہا کرتے تھے کہ مجھے میدان جنگ میں سخت رات جس میں اپنے دشمنوں سے لڑوں اس شب عروسی سے زیادہ مرغوب ہے جس میں میری محبوبہ ہمکنار ہو، آخر وقت جب اپنی زندگی سے مایوس ہوگئے تھے کہتے تھے کہ افسوس میری ساری زندگی

میدان جنگ میں گزری اور آج بستر مرگ پر جانوروں کی طرح ایڑیاں رگڑ
کے جان دے رہا ہوں، خدا نے ان کے قدموں میں یہ خاص برکت دی تھی
کہ جدھر رخ کیا ناکام واپس نہ ہوئے جب وہ لڑائی میں شریک ہو جاتے تو
آں حضرت ﷺ فرماتے کہ اب لڑائی کا تنور گرمایا۔'' (۲)

حضرت خالدؓ بن ولید کی عظیم المرتبت شخصیت پر مصر سے ایک نہایت مبسوط کتاب شائع ہوئی جس کا اردو ترجمہ ''اللہ کی تلوار'' کے نام سے بہت مقبول ہوا، اس کے متعلق صباح الدین صاحب نے لکھا ہے کہ خالد بن ولیدؓ پر شاہ صاحب کے ۲۸ صفحے اس ضخیم کتاب پر بھاری ہیں۔ (۳) اس سے کتاب کی اہمیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ اس کتاب کو دارالمصنفین نے ۱۹۲۸ء میں پہلی بار شائع کیا۔

(۲) سیر الصحابہ جلد ششم

سیر الصحابہ کی اس جلد میں حضرات حسنینؓ، حضرت امیر معاویہؓ اور حضرت عبداللہ ابن زبیرؓ کے حالات زندگی، اخلاق و کردار، فضائل و مناقب اور ان کے مذہبی و سیاسی اور مجاہدانہ کارناموں کی تفصیلات قلم بند کی گئی ہیں، یہ حضرات گو زمانہ و عمر کے لحاظ سے اکابر صحابہؓ کی صف کے ہیں لیکن ان حضرات سے بعض اہم مذہبی و سیاسی حوادث و واقعات تاریخ وابستہ ہیں اور جو اسلامی تاریخ کا نہایت اہم باب ہیں، اس اہمیت کے پیش نظر یہ جلد ان کے لیے مخصوص کی گئی ہے، ان حضرات پر قلم اٹھانا آسان نہیں کیونکہ ان کی زندگی میں سیاسی نشیب و فراز بڑے نازک ہیں، اس بات کا خود شاہ صاحب کو بھی احساس تھا چنانچہ وہ دیباچے میں لکھتے ہیں:

''در حقیقت ان بزرگوں کے حالات لکھنا بہت اہم اور نازک
فرض ہے کیونکہ ان بزرگوں کے نزاعی امور نے مسلمانوں کے مختلف گروہوں
میں بڑے بڑے سیاسی اور مذہبی اختلافات پیدا کر دیئے ہیں یہ ایک امر
مسلمہ ہے کہ تاریخی حقائق اور جذبات دو جدا جدا چیزیں ہیں اس لیے ان کے
حالات اس طرح لکھنا کہ تاریخی حقائق کا دامن بھی ہاتھ سے نہ چھوٹنے پائے

اور کسی جماعت اور کسی عقیدہ وخیال کے مسلمانوں کو اس سے ٹھیس بھی نہ لگے
بہت مشکل امر اور پانی سے کھیلنا اور دامن کو تری سے بچانا ہے تاہم میں نے
دونوں باتوں کو نباہنے اور قلم کو جادہ اعتدال پر قائم رکھنے کی پوری کوشش کی
ہے۔"(۴)

یہ واقعہ ہے کہ مصنف نے حد اعتدال سے تجاوز نہیں کیا اور سلامت روی کا وہی نمونہ پیش کیا جو ان کے پیش رو بزرگوں کی تصنیفات میں موجود ہے، البتہ شاہ صاحب کے قلم میں جو ادبی رعنائی تھی ان تذکروں میں اس کا پرتو صاف دکھائی دیتا ہے، ایک اقتباس ملاحظہ ہو اس میں امام حسینؓ کی شہادت کا ذکر ہے، وہ لکھتے ہیں:

"دس محرم الحرام ۱۱ ہجری مطابق ۶۸۱ عیسوی میں خانوادہ نبوی کا
آفتاب ہدایت ہمیشہ کے لیے روپوش ہوگیا، اس شقاوت اور سنگ دلی پر
زمین کانپی، عرش الٰہی خوں رویا، زمیں سے خون کے چشمے پھوٹے، شجر وحجر
سے نالہ وشیون کی صدائیں بلند ہوئیں، جن وانس نے سینہ کوبی کی، ملائکہ
آسمانی میں صف ماتم بچھی کہ آج ریاض نبوی کا گل سرسبد مرجھا گیا، علیؓ کا چمن
اجڑ گیا، اور فاطمہؓ کا گھر بے چراغ ہوگیا۔"(۵)

یہ کتاب پہلی بار ۱۹۳۲ء میں دارالمصنفین نے شائع کی۔

(۳) سیر الصحابہ (جلد ہفتم)

یہ سلسلہ سیر الصحابہ کی آخری جلد ہے اسی پر یہ مبارک سلسلہ پایہ تکمیل کو پہونچا، علامہ شبلی کی خواہش کی تکمیل کے لئے مولانا عبدالسلام ندوی نے اسوہ صحابہ سے اس کا آغاز کیا تھا جو شاہ صاحب کے قلم سے پورا ہوا، خود شاہ صاحب لکھتے ہیں:

"دارالمصنفین سالہا سال سے جس مقدس چمن کی آبیاری میں
مصروف تھا آج اس کا آخری گلدستہ ہدیہ ناظرین ہے یعنی سیر الصحابہ کا جو عظیم
الشان سلسلہ برسوں سے چل رہا تھا وہ بحمد للہ اس جلد پر تمام ہوگیا۔"(۶)

اس میں ایک سو پچاس ایسے صحابہ کرام کے حالات وسوانح اور کارنامے بیان کئے گئے ہیں جنھوں نے فتح مکہ کے بعد اسلام قبول کیا یا فتح مکہ سے پہلے ہی مشرف بہ اسلام ہو چکے تھے مگر ہجرت نہ کر سکے تھے نیز ان صحابہ کرام کا بھی ذکر ہے جو عہد سالت میں صغیر السن تھے۔

سیر الصحابہ کی دوسری جلدوں کی طرح اس میں بھی صحابہ کرام کے حالات کے ساتھ صحابہ کرام کے آخری زمانہ اور تابعین عظام کے ابتدائی دور کے بعض اہم سیاسی وتاریخی واقعات آگئے ہیں، اسے دار المصنفین نے ۱۹۳۴ء میں شائع کیا۔

(۷) عرب کی موجودہ حکومتیں

۱۹۳۴ء ہی میں شاہ صاحب کی کتاب ''عرب کی موجودہ حکومتیں'' شائع ہوئی، اس میں جزیرۃ العرب کی تمام قابلِ ذکر حکومتوں اور ملکوں نجد وحجاز، عسیر، یمن، لحج، نواحی تسعہ، بحرین، کویت، عراق بشمول فلسطین وشام کی اجمالی تاریخ اور جغرافیہ لکھا گیا ہے، جس سے اس عہد کے جزیرۃ العرب کی سیاسی تمدنی اور جغرافیائی تاریخ سامنے آجاتی ہے، جناب سید صباح الدین عبدالرحمٰن مرحوم لکھتے ہیں:

> ''اس کے مطالعہ سے آج سے نصف صدی پہلے جو سیاسی شطرنج کی بساط بچھائی گئی تھی اس کو سمجھنے میں ضرور مدد ملے گی، اسکو پڑھ کر عبرت ہوتی ہے کہ عربوں کو اپنے باہمی اختلافات اور مناقشات سے کیسے کیسے برے دن دیکھنے پڑے ان کی حکومتیں گئیں، خوں ریزیاں ہوئیں، غلامی کا طوق ان کی گردنوں میں ڈالا گیا، ان کی خودداری اور عزت نفس بھینٹ چڑھی، خود اسلام کی حمیت وغیرت سخت آزمائش میں مبتلا ہوگئی مگر ماضی کے ان عبرت ناک واقعات سے انھوں نے سبق نہیں سیکھا اور نہ کوئی عبرت حاصل کی، ان کی انسانی اور جبلی سرشت، ان کی دینی غیرت پر غالب ہوتی رہی، یہ ساری چیزیں شاہ صاحب کی اس کتاب سے ناظرین کے سامنے

واضح اور منقح ہو جائیں گی اس لحاظ سے اس کی اہمیت نظر انداز نہیں کی جاسکتی۔''(۷)

یہ کتاب دو حصوں پر مشتمل ہے پہلے حصہ میں عرب کا جغرافیہ ہے جو مکہ مکرمہ میں مقیم ایک طالب علم کے قلم سے ہے اور انھیں کی خواہش پر ان کا نام درج نہیں کیا گیا ہے، دوسرا حصہ شاہ صاحب کے قلم سے ہے۔ جس میں عرب کی ان حکومتوں کی تاریخ ہے جن کا ذکر اوپر آچکا ہے۔

اس کتاب کی ایک بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں دوسرے ملکوں سے ان عرب حکومتوں کے تعلقات اور ان کی سیاسی حیثیت بھی واضح کی گئی ہے۔ کتاب معتبر و مستند مراجع کی مدد سے لکھی گئی ہے، سفرنا ملوك العرب از: امین ریحانی، خطط الشام از: علامہ محمد کرد علی، تاریخ یمن از: شیخ عبدالواسع، العرفان اور عراق کی تعلیمی روداد اس کتاب کے بنیادی ماخذ ہیں۔

موضوع کے لحاظ سے اردو میں لکھی جانے والی یہ پہلی کتاب ہے۔ جس میں بیسویں صدی کے ابتدائی عشروں کی عربوں کی بیشتر تاریخ اس میں آگئی ہے، اس عہد کی تاریخ سے واقفیت کے لیے یہ کتاب آج بھی بے حد مفید ہے۔

(۵) تاریخ اسلام (جلد اول)

یہ کتاب منصوبہ تاریخ اسلام کی پہلی کڑی ہے اس میں عہد رسالت وخلافت راشدہ کی مذہبی سیاسی اور علمی تاریخ قلم بند کی گئی ہے، مقدمہ میں آنحضرت ﷺ کی بعثت سے پہلے کے عرب کی تاریخ اور اس کے قدیم جغرافیہ پر عمدہ بحث کی گئی ہے پھر آنحضرت ﷺ کی ولادت باسعادت سے وفات تک کے مختصر حالات ہیں نیز آپ ﷺ کے اخلاق و فضائل اور اس انقلاب آفریں دور کے سیاسی تہذیبی اور تمدنی نقوش پیش کئے گئے ہیں، اس کے بعد الگ الگ ابواب میں خلفائے راشدین حضرت ابوبکر صدیقؓ، حضرت عمر فاروقؓ، حضرت عثمان غنیؓ اور حضرت علیؓ مرتضی کے حالات وسوانح اخلاق وفضائل ومناقب اور عہد خلافت راشدہ کے ہر قسم کے سیاسی اور علمی وتہذیبی واقعات، فتوحات اور نظام خلافت کی مفصل تاریخ معتبر و

مستند ماخذوں سے بیان کی گئی ہے، یہ کتاب دارالمصنفین نے ۱۹۳۹ء میں شائع کی۔

(۶) تاریخ اسلام (جلد دوم)

تاریخ اسلام کی اس دوسری جلد میں بنی امیہ کے سوسالہ دور حکومت کی اجمالی تاریخ بیان کی گئی ہے، شروع میں خاندان بنی امیہ کی مختصر تاریخ ہے پھر دولت اموی کے بانی حضرت امیر معاویہؓ (۱۶۶۱-۱۶۶۹ء) سے لے کر آخری اموی حکمراں مروان ثانی (۱۷۴۹-۱۷۷۵ء) تک کے تمام حکمرانوں کے حالات، نظام حکمرانی اور ان کے عہد حکومت پر تنقید وتبصرہ بھی کیا گیا ہے جس سے اس عہد کی ترقی اور پھر تنزل کے اسباب پر بھی روشنی پڑتی ہے اور اس عہد کے تمام خدوخال نمایاں ہو جاتے ہیں۔

اموی حکمرانوں کے حالات، ملکی فتوحات اور نظام حکومت کی تفصیل کے بعد سلطنت کے زوال کے اسباب بیان کئے گئے ہیں۔ آخر میں اس عہد کی علمی حالت اور علوم وفنون کی ترقی وایجادات وغیرہ پر خاص طور سے تبصرہ کیا گیا ہے جس سے سیاسی تاریخ کے ساتھ اس عہد کی علمی تاریخ کا ایک مرقع سامنے آجاتا ہے۔

(۷) تاریخ اسلام (جلد سوم)

تاریخ اسلام کے اس حصہ میں خلافت عباسیہ کی دوسو برسوں کی تاریخ قلم بند کی گئی ہے اور خلافت عباسیہ بغداد کی ابتداء ابوالعباس سفاح (۱۳۲ھ) سے لے کر ابواسحاق متقی باللہ (۳۳۲ھ) تک عباسی حکمرانوں کے حالات اور کارناموں اور ان کے عہد خلافت کی سیاسی و علمی تاریخ کی تفصیل سپرد قلم کی گئی ہے، اس کتاب سے دولت عباسیہ کی ابتدائی دوسو برسوں کی تاریخ سامنے آجاتی ہے، اسے دارالمصنفین نے ۱۹۴۴ء میں شائع کیا۔

(۸) تاریخ اسلام (جلد چہارم)

یہ تاریخ بنوعباس کا دوسرا حصہ ہے اس میں مستکفی باللہ (۳۳۳-۳۳۴ھ) سے لے کر آخری عباسی خلیفہ معتصم باللہ (۶۴۰-۶۵۵ھ) تک کی سیاسی تاریخ تحریر کی گئی ہے اسی حصہ میں مصر کی خلافت عباسیہ کی بھی ۶۵۹-۹۲۳ھ تک کی اجمالی سیاسی تاریخ اور حکمرانوں کے عہد

کے حالات وواقعات لکھے گئے ہیں، اس طرح یہ حصہ دولت عباسیہ کی تاریخ کا مکمل مرقع ہوگیا ہے، آخر میں عہد عباسیہ کے تہذیبی وتمدنی کارناموں پر مختصر مگر جامع تبصرہ کیا گیا ہے۔

یہ کتاب جس عہد کی تاریخ ہے اسی عہد میں عباسیوں کا زوال شروع ہوا جسے بالآخر تاتاریوں کے طوفان نے ہمیشہ کے لیے ختم کردیا، اسی عہد میں دیلمیوں اور سلجوقیوں کا علم اقبال بلند ہوا اس لیے ضمنی طور پر ان کی بھی اجمالی تاریخ اس میں آگئی ہے ان کے علاوہ غزنوی، نابکی، ایوبی اور خوارزمی وغیرہ متعدد حکومتیں چونکہ اسی دور میں قائم ہوئیں اس لیے ان کی بھی مختصر تاریخ اس کتاب میں بیان ہوئی ہے، خود شاہ صاحب لکھتے ہیں:

> "یہ خلافت بغداد کے ساتھ اس زمانہ کی مشرق کی بڑی بڑی حکومتوں کے اہم حالات وکوائف کی بھی اجمالی تاریخ بن گئی ہے اور اس کے مطالعہ سے دنیائے اسلام خصوصاً مشرق کے چار صدیوں کے سیاسی مدوجزر کا نقشہ سامنے آجاتا ہے۔" (۸)

تاریخ اسلام کی چاروں جلدیں شاہ صاحب کی بلکہ دارالمصنفین کی انتہائی مقبول ترین کتابیں ہیں اب تک ان کے بیسیوں ایڈیشن بڑی تعداد میں چھپ کر مقبول ہو چکے ہیں۔

(۹) تابعین

اس میں صحابہ کرامؓ سے فیض یافتہ چھیانوے اکابر تابعین کرامؒ کے سوانح زندگی اور ان کے مذہبی، اصلاحی، تبلیغی، سیاسی اور مجاہدانہ کارناموں کی تفصیل پیش کی گئی ہے، حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ، حضرت حسن بصریؒ، اویس قرنیؒ، امام زین العابدینؒ، امام باقرؒ، امام جعفر صادقؒ، محمد بن حنفیہ، ابن شہاب زہری وغیرہ جیسے اہم تابعین کرام کا تذکرہ اس میں شامل ہے۔

دیباچہ میں کتاب کی اہمیت وضرورت اور اس کے مشتملات کا ذکر ہے، مقدمہ نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شیروانی کے قلم سے ہے۔

تابعین عظام کے اس جامع تذکرہ میں اس عہد کے بعض سیاسی اور اخلاقی واقعات بھی آگئے ہیں، خود شاہ صاحب لکھتے ہیں:

"اس میں یہ کوشش کی گئی ہے کہ اکابر تابعین کرام کے علمی اخلاقی
اور مذہبی کارناموں کو اس طرح پیش کیا جائے کہ اس عہد کی پوری علمی واخلاقی
تاریخ سامنے آجائے۔" (۹)

اس طرح یہ کتاب تاریخ وتذکرہ کی مشترک کتاب ہوگئی ہے، تابعین اور ان کے عہد زریں پر اردو زبان میں یہ پہلی مفصل کتاب تھی جسے دارالمصنفین نے قوم کے سامنے پیش کیا، اس کی افادیت بیان کرتے ہوئے جناب سید صباح الدین عبدالرحمٰن مرحوم لکھتے ہیں:

"یہ کتاب تو اس لائق ہے کہ ہر گھر میں موجود رہے اور ان
بزرگوں نے اپنی زندگی میں اخلاق کے مذکورہ بالا محاسن کو جس طرح اختیار
کر کے دکھایا اگر مسلمان اس اسوہ کو برابر سامنے رکھیں اور اس پر عمل کریں تو
وہ تمام انسانوں کے لیے رحمت بن سکتے ہیں۔" (۱۰)

(۱۰) ادبی نقوش

شاہ صاحب کے پاکیزہ وارفع ادبی مذاق کے متعلق کچھ کہنا تحصیل حاصل ہے اسی ذوق کی جھلک ان ادبی مضامین میں ملتی ہے جو جگر، اصغر، فانی، ریاض، مجذوب اور بعض دوسرے شعرا کے دواوین پر نقد وتبصرہ کی شکل میں لکھے گئے، خاص طور پر اقبال سہیل، عبدالسلام ندوی، یحیٰی اعظمی اور علامہ اقبال سے متعلق ان کے ادبی مضامین بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔

ان کے جچے تلے تبصرے، تنقیدیں اور ان کا اسلوب نگارش ادبی حلقوں میں بے حد پسند کیا جاتا، بعض مضامین مثلاً اردو شاعری میں ہندو کلچر اور اردو زبان کی لسانی علمی اور تمدنی حیثیت، ادب وانشا اور تحقیق وتنقید کا اعلیٰ نمونہ ہیں، ان مضامین سے شاہ صاحب کی ادبی و تنقیدی فہم وبصیرت کا اندازہ بھی ہوتا ہے۔

ان مضامین کی مقبولیت اور افادیت کے پیش نظر شاہ صاحب کو ان کی اشاعت کا خیال پیدا ہوا چنانچہ انہوں نے اپنے نو ادبی مضامین کو ادبی نقوش کے نام سے مرتب کیا جسے ۱۹۶۰ء میں ادارۂ فروغ اردو لکھنؤ نے شائع کیا جو بہت مقبول ہوا اور بعض امتحانات کے نصاب

میں بھی شامل کیا گیا۔(۱۱)

(۱۱) دین رحمت

اسلام ایک دین رحمت ہے وہ پوری انسانیت کے لیے نازل کیا گیا ہے اور بلا تفریق مذہب وملت، دوست ودشمن، اپنے پرائے، سب کے لیے سراسر عدل وانصاف اور رحمت و نعمت ہے۔

اس کتاب میں شاہ صاحب نے اسی ایجاز کا اطناب کیا ہے اور قرآن وحدیث کی روشنی میں اس کی تمام تفصیلات پیش کردی ہیں یہ پندرہ ابواب پر مشتمل ہے آخری ابواب میں مسلمانوں کے علوم وفنون اوران کی ایجادات واختراعات اوران کے علمی احسانات کا ذکر ہے۔

اپنے موضوع پر یہ ایک منفرد کاوش ہے، خود شاہ صاحب کو اپنی تصنیفات میں یہ زیادہ پسند تھی، ان کی خواہش تھی کہ اسے ہندی میں ترجمہ کیا جائے،(۱۲) بعض غیر مسلم ہندی ادیبوں نے بھی اس کے ہندی ترجمہ کی پیش کش تھی (۱۳) مگر شاہ صاحب کی یہ خواہش اب تک پوری نہ ہوسکی۔

(۱۲) حیات سلیمان

یہ مولانا سید سلیمان ندویؒ کی سوانح عمری ہے حیات شبلی ہی کی طرح ضخیم اور اسی انداز پر لکھی گئی ہے، اس میں سید صاحب علیہ الرحمہ کی تحریروں کے اقتباسات کثرت سے دیئے گئے ہیں، اس لیے اس کی حیثیت سوانح عمری کے ساتھ خودنوشت کی بھی ہوگئی ہے اور صحت واقعہ بھی مسلّم ہوگئی ہے۔

شاہ صاحب کی اس کتاب کی ترتیب سنین کے لحاظ سے ہے اور اسے نو ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے، پہلے باب میں وطن، خاندان اور تعلیم وتربیت کا ذکر ہے، دوسرے باب میں تعلیم سے فراغت اور قیام دارالمصنفین سے پہلے کے حالات وخدمات کا بیان ہے، تیسرا باب دارالمصنفین کے قیام اور اس کی ابتدائی خدمات اور بعض تصانیف کے ذکر پر مشتمل ہے، چوتھے باب میں قومی وسیاسی خدمات کی تفصیل ہے، پانچویں باب میں ۱۹۲۷ء سے ۱۹۳۴ء تک کے

حالات اور کارناموں کا مفصل تذکرہ ہے، چھٹے باب میں ۱۹۳۴ء سے ۱۹۴۷ء تک کے حالات اور قومی وملی خدمات کا بیان ہے، ساتویں باب میں قیام بھوپال کے حالات ہیں، آٹھویں باب میں ذاتی حالات اور اخلاق وعادات کی تفصیل ہے، آخر میں وفات پر لکھے جانے والے چند مراثی وقطعات درج کئے گئے ہیں، ضمیمہ میں بعض اہم شذرات معارف کے اقتباسات سے ان کے قومی وملی احساسات پیش کئے گئے ہیں، اس طرح یہ سید صاحب کی سوانح عمری کے ساتھ عہد سلیمانی کی تاریخ بھی ہوگئی ہے، خود شاہ صاحب لکھتے ہیں:

> ''مولانا شبلی کے کاموں کی مدت بتیس سال ہے اور سید صاحب کی تقریباً نصف صدی، اس طویل مدت میں انھوں نے گوناگوں مذہبی، علمی، تعلیمی، قومی وملی اور سیاسی کام انجام دیئے، اس طرح اس کتاب میں سید صاحب کے سوانح کے ضمن میں اس دور کے ہندوستان خصوصاً مسلمانوں کی ہر قسم کی تاریخ آگئی ہے۔'' (۱۴)

یہ سوانح عمری دارالمصنفین نے ۱۹۷۴ء میں شائع کی، اس کا شمار دارالمصنفین کی مقبول ترین کتابوں میں ہوتا ہے، اب تک اس کے تین ایڈیشن نکل چکے ہیں۔

تراجم: شاہ صاحب نے اپنی طویل علمی زندگی میں ضرورت وافادیت کے پیش نظر دو کتابوں کے ترجمے بھی کئے، یہاں ان کا مختصر تعارف پیش کیا جاتا ہے۔

(۱۳) انوارا لعیون فی اسرار المکنون

یہ شاہ صاحب کے جد امجد مخدوم شیخ احمد عبدالحق رودولویؒ کے ملفوظات کا مجموعہ ہے، جسے شیخ عبدالقدوس گنگوہی نے مرتب کیا تھا، شاہ صاحب نے جناب عزیز احمد احمدی کی فرمائش پر اسے اردو کا جامہ پہنایا اور مطبع معارف ہی سے طبع کرایا، مگر مترجم کی حیثیت سے شاہ صاحب نے اس پر اپنا نام نہیں لکھوایا جس سے مترجم کے بارے میں بعض لوگوں کو اشتباہ ہوسکتا ہے مگر جناب سید صباح الدین عبدالرحمن مرحوم نے لکھا ہے کہ ''راقم سطور کو اچھی طرح معلوم ہے کہ یہ ترجمہ ان ہی کا کیا ہوا ہے۔'' (۱۵)

(۱۴) اسلام اور عربی تمدن

یہ کتاب شام کے مشہور فاضل علامہ محمد کردعلی کی کتاب الاسلام والحضارۃ العربیۃ کا اردو ترجمہ ہے، اس میں اسلام اور اسلامی تہذیب وثقافت پر مغربی مصنفین اور اہل قلم کے اعتراضات کا جواب دیا گیا ہے اور یورپ پر اسلام اور مسلمانوں کے علمی اخلاقی اور تمدنی احسانات اور ان پر مسلمانوں کے اثرات کی نشاندہی کی گئی ہے، آخر میں مسلمانوں کی علمی و تمدنی تاریخ پر اجمالی تبصرہ کیا گیا ہے، یہ کتاب دارالمصنفین نے ۱۹۵۲ء میں شائع کی۔

(۱۵) خریطۂ جواھر

مشہور صوفی شاعر مرزا مظہر جان جاناں نے خریطۂ جواہر کے نام سے فارسی اشعار کا ایک انتخاب کیا تھا جو بڑی تقطیع پر ۸۰ صفحوں کا ہے، مرزا مظہر جان جاناں شاہ صاحب کے محبوب شاعر تھے اور ان کی بیاض خریطۂ جواہر سے بھی ان کو بڑی شیفتگی تھی، اس کے اشعار ان کے نوک زبان رہتے تھے، آخر میں ان کو خیال پیدا ہوا کہ اب فارسی شعروادب کا مذاق ختم ہو رہا ہے اس لیے اردو ترجمہ وتشریح کے ساتھ خریطۂ جواہر کی اشاعت مفید ہوگی، انھوں نے لکھا ہے کہ:

> "اس میں انھوں نے فارسی شاعری کے پورے دفتر کا عطر کھینچ دیا ہے، خریطۂ جواہر ان کتابوں میں ہے جنھوں نے ہندوستان میں فارسی شاعری کا صحیح ذوق پیدا کیا ہے اب فارسی شعروادب کا ذوق ختم ہو رہا ہے، بہتیرے خریطۂ جواہر کے نام سے واقف نہ ہوں گے اس لیے عرصہ سے اس پر تبصرہ کا خیال تھا جو اب پورا ہوا" (۱۶)

معارف میں شاہ صاحب نے یہ سلسلۂ مضامین شروع کیا تو بے حد پسند کیا گیا اور بقول صباح الدین صاحب اس کی داد اس وقت کے ادبی گروہ کے سالار کارواں جناب رشید احمد صدیقی اور علمی جماعت کے سرخیل مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے بڑی فراخدلی سے دی۔ (۱۷)

شاہ صاحب نے خریطۂ جواہر کے پسندیدہ اشعار کا ترجمہ وتشریح کی ہے، اس طرح یہ انتخاب کا ایک انتخاب ہے لیکن اس سے شاہ صاحب کے فارسی شعروادب کے پاکیزہ ذوق،

سخن فہمی اور سخن سنجی کے ساتھ نکتہ آرائی کا اندازہ ہوتا ہے، چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔

طالب آملی کا شعر ہے

بسوئے خویشتن از لطف گستاخانہ کش وستم

کہ من بسیار مجوبم ہم آغوشی نمی دانم

شاہ صاحب اس کی تشریح اس طرح کرتے ہیں:

''ایک ناتجربہ کار عاشق التجا کرتا ہے کہ تو پیار سے بے حجابانہ میرا ہاتھ اپنی طرف کھینچ لے میں بہت شرمندہ ہوں کہ ہم آغوشی کا طریقہ نہیں جانتا۔''(۱۸)

باقر کاشانی کا شعر ہے

یارب آں سوز فگن در دل دیوانہ ما

کہ کلیم آید و آتش پرواز سینہ ما

اس کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''خدایا میرے دل میں وہ سوز پیدا کردے کہ موسیٰ کلیم اللہ (جو آگ کی تلاش میں طور کی طرف گئے) آکر میرے سینہ سے آگ لے جائیں۔''(۱۹)

ترجمہ و تشریح کے ساتھ شاہ صاحب نے کہیں کہیں تبصرہ بھی کیا ہے یہ تبصرے انتہائی مختصر اور جامع ہیں، لیکن برمحل اور جچے تلے ہیں۔

اسے شاہ صاحب کی وفات کے بعد ۱۹۷۵ء میں جناب سید صباح الدین عبدالرحمن نے کتابی صورت میں سے شائع کیا۔

شاہ صاحب کی ان گراں مایہ تصنیفات سے ان کے مطالعے کی وسعت اور مختلف موضوعات پر بھرپور دسترس اور ان کی گراں قدر علمی و ادبی خدمات کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

مضامین

ان بلند پایہ تصنیفات کے علاوہ شاہ صاحب نے مختلف موضوعات پر علمی، تحقیقی اور ادبی مضامین لکھے، افادیت کے پیش نظر یہاں ان کی ایک فہرست درج کی جاتی ہے یہ مضامین ماہنامہ معارف میں شائع ہوئے ہیں۔

- تدوین قرآن۔ مئی ۱۹۴۹ء
- فہم قرآن کے اصول وشرائط۔ اگست، ستمبر ۱۹۴۰ء
- مظاہر قرآن۔ تبصرہ۔ ستمبر ۱۹۵۳ء
- انکار حدیث۔ مئی جون ۱۹۳۳ء
- حضرت ابو ہریرہؓ پر گستاخانہ جرح۔ مئی جون ۱۹۳۱ء
- ترجمان السنہ جلد چہارم۔ تبصرہ۔ اگست ۱۹۶۹ء
- اوقات نماز حضرت ابن عباسؓ پر الزام کا جواب۔ نومبر ۱۹۳۱ء
- مجموعہ قوانین اسلام۔ نومبر ۱۹۶۹ء
- اطرافیہ۔ جنوری ۱۹۳۲ء
- شعلہ طور۔ نومبر، دسمبر ۱۹۳۲ء
- مستشرقین کے متعلق دو متضاد رائیں۔ اپریل ۱۹۳۴ء
- تابعین اور ان کے علمی و مذہبی کارنامے۔ اکتوبر، نومبر ۱۹۳۶ء
- مولانا عبدالسلام ندوی۔ جنوری ۱۹۵۷ء
- اسلام میں دوسرے مذاہب اور اہل مذاہب کی حیثیت۔ مارچ ۱۹۶۵ء
- تاریخ افکار و سیاسیات اسلامی۔ اگست تا دسمبر ۱۹۴۳ء، و جنوری فروری ۱۹۴۴ء
- کلچر کی وحدت کا مقصد۔ جولائی ۱۹۴۹ء
- امام ترمذی اور ان کی جامع۔ جنوری فروری ۱۹۴۳ء
- کعب بن زبیرؓ۔ اگست ۱۹۴۳ء

- مشہد مقدس طوس ۔ فروری ۱۹۲۸ء
- بغداد اور اس کا تمدن ۔ اکتوبر نومبر ۱۹۲۸ء
- حضر موت ۔ مارچ ۱۹۲۷ء
- یمن ۔ دسمبر ۱۹۲۹ء
- موجودہ فرماں روایان عرب ۔ عسیر ۔ جنوری ۱۹۳۰ء
- موجودہ فرماں روایان عرب ۔ سلطان عبدالکریم فضل ۔ فروری ۱۹۳۰ء
- ایضاً ۔ مارچ ۱۹۳۰ء
- موجودہ فرماں روایان عرب ۔ نجد ۔ اپریل ۱۹۳۰ء
- موجودہ فرماں روایان عرب ۔ نو زیر حمایت قبائل ۔ مارچ ۱۹۳۰ء
- موجودہ فرماں روایان عرب ۔ بحرین ۔ اگست ۱۹۳۰ء
- تیموری عہد کی خطاطی اور مشہور خطاط ۔ اگست ۱۹۶۳ء
- اردو زبان کی لسانی علمی اور تمدنی اہمیت ۔ دسمبر ۱۹۵۱ء و جنوری ۱۹۵۲ء
- وادی ایمن ۔ خواجہ عزیز الحسن مجذوب ۔ جولائی ۱۹۴۷ء
- سرود زندگی ۔ اصغر گونڈوی ۔ ستمبر، اکتوبر ۱۹۳۵ء
- ریاض رضوان ۔ ریاض خیر آبادی ۔ نومبر دسمبر ۱۹۳۹ء
- سہیل مرحوم اور نعت نبویؐ ۔ نومبر ۱۹۵۶ء
- اقبال کی تعلیمات پر ایک نظر ۔ اکتوبر تا دسمبر ۱۹۷۱ء و جنوری ۱۹۷۲ء
- کیا اقبال فرقہ پرست تھے ۔ جنوری فروری ۱۹۵۰ء
- حضرت الاستاذ کی دینی و علمی خدمات ۔ مئی، جون ۱۹۵۵ء
- ارمغان سلیمان ۔ جولائی ۱۹۷۱ء
- مولانا شیروانی کی تصویر ان کی تحریر کے آئینہ میں ۔ دسمبر ۱۹۵۰ء
- انسانی عظمت و شرف ۔ جولائی ۱۹۶۵ء

- خریطہ جواہر۔جنوری تا اکتوبر ۱۹۷۳ء
- حیات سلیمانی کا ایک صفحہ۔جنوری تا مارچ ۱۹۶۸ء
- خطبہ استقبالیہ آل انڈیا اسلامک اسٹڈیز کانفرنس منعقدہ دارالمصنفین۔جنوری ۱۹۷۰ء
- نزہۃ الخواطر۔اگست ۱۹۷۰ء
- جزءجۃ الوداع۔جنوری ۱۹۷۱ء
- حکیم حافظ خواجہ شمس الدین۔مئی ۱۹۷۱ء
- سید علی اختر تلہری۔مئی ۱۹۷۱ء
- بعض شبہات اور اس کا جواب۔ستمبر ۱۹۷۲ء
- ایک تعارف۔نومبر ۱۹۶۷ء
- کچھ قابل غور باتیں۔جون، جولائی ۱۹۷۴ء
- میرا سفر حج۔اگست ۱۹۶۶ء
- سفر حج کی مختصر روداد۔اپریل مئی ۱۹۷۴ء
- انیس الحجاج ہندوستان کا فارسی میں پہلا سفرنامہ۔جنوری ۱۹۶۴ء
- ۱۹۲۷ء کی علمی ترقیاں۔مارچ ۱۹۲۸ء
- افغانستان کی علمی ترقیاں۔جون ۱۹۲۸ء
- خالد ولیلیٰ کا مفروضہ افسانہ عشق۔اکتوبر ۱۹۳۳ء

☆☆☆☆☆

حواشی:

(۱) ماہنامہ معارف مئی ۱۹۸۱ء، ص ۳۲۰

(۲) مہاجرین حصہ دوم ص ۳۴۱

(۳) ماہنامہ معارف مئی ۱۹۸۱ء، ص ۳۲۲

(۴) سیر الصحابہ جلد ششم ص ۱۰۹۔ دار المصنفین، اعظم گڑھ ۱۹۳۲ء

(۵) ایضاً ص ۲۲۲

(۶) سیر الصحابہ جلد ہفتم۔ ص ۷ (دیباچہ)

(۷) ماہنامہ معارف جولائی ۱۹۸۱ء ص ۳۲

(۸) تاریخ اسلام جلد چہارم دیباچہ ص ۲

(۹) تابعین دیباچہ ص ۵، مطبوعہ دار المصنفین اعظم گڑھ

(۱۰) ماہنامہ معارف فروری ۱۹۸۲ء ص ۹۲

(۱۱) تعمیر حیات لکھنؤ (شاہ معین الدین احمد ندوی نمبر) ص ۳۰

(۱۲) ایضاً ص ۱۸

(۱۳) ایضاً ص ۲۲

(۱۴) حیات سلیمان دیباچہ ص ۴

(۱۵) ماہنامہ معارف مارچ ۱۹۸۱ء ص ۱۸۷

(۱۶) خریطۂ جواہر ص ۷

(۱۷) ایضاً ص ۲

(۱۸) ایضاً ص ۹

(۱۹) ایضاً ص ۱۳



(باب سوم)

بحیثیت تذکرہ نگار

شاہ صاحب کی تصنیفی زندگی کا آغاز تذکرہ نگاری سے ہوا، انھوں نے سب سے پہلے مہاجرین جلد اول میں حضرت عبداللہ بن عباسؓ اور حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ کا تذکرہ لکھ کر کتاب کو مکمل کیا، پھر سیر الصحابہ جلد سوم، ششم اور ہفتم کے ذریعہ اس سلسلہ کو پایہ تکمیل تک پہنچایا، اس کے بعد تابعین جیسی معرکہ آرا کتاب بھی لکھی۔

قدیم اردو تذکرہ نگاری کا دائرہ محدود تھا، عام طور سے اس وقت حالات بہت مختصر لکھے جاتے تھے اس اختصار کی وجہ سے صاحب تذکرہ کی شخصیت کا پورے طور پر اندازہ لگانا دشوار ہو جاتا تھا نیز علمی وادبی خدمات پر تبصرہ بھی اس قدر محدود و مختصر ہوتا تھا کہ تشنگی اور بڑھ جاتی تھی لیکن بہ تدریج یہ نقائص واسقام اس فن کی ترقی سے دور ہوتے گئے تاہم یہ حقیقت بہر حال مسلم ہے کہ اردو سوانح کی داغ بیل تذکرہ نگاری نے ہی ڈالی۔

شاہ صاحب کا دور تذکرہ نویسی کے ارتقا کا دور تھا، یہ کہنے میں مضائقہ نہیں کہ انھوں نے سیر الصحابہ کے متعدد حصے اور تابعین جیسی کتاب لکھ کر اس فن کو درجۂ کمال تک پہنچا دیا۔

شاہ صاحب کی تذکرہ نگاری کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ مفصل حالات کے ساتھ صاحب تذکرہ کی زندگی کے تمام پہلوؤں کو واضح کرتے ہیں اور علمی و سیاسی اور دیگر خدمات کا منظر نامہ اس طرح پیش کرتے ہیں کہ پوری شخصیت واضح طور پر سامنے آجاتی ہے۔

قدیم تذکروں میں مراجع و ماخذ کے حوالوں کا اہتمام نہیں تھا، لیکن شاہ صاحب نے

علامہ شبلی اور سید صاحب کے تتبع میں تمام مراجع سے استفادہ اور ان کی نشاندہی کو ہمیشہ ملحوظ رکھا، شاہ صاحب کے تذکرے ان مبارک و برگزیدہ ہستیوں کے احوال ہیں جو مجموعہ فضائل و اخلاق تھے تاہم ان کے احوال بشری اوصاف اور بعض اجتہادی آرا سے خالی نہیں، اس لیے ان کی مرقع آرائی آسان اور سہل نہیں، لیکن شاہ صاحب کے قلم نے جس احتیاط، اعتدال اور توازن سے تصویر کشی کی ہے وہ تذکرہ و سوانح نگاری کا بہترین نمونہ ہے۔

شاہ صاحب کے قلم کی خوبیوں میں خاص وصف ان کا منفرد اسلوب ہے، سلیس و شگفتہ زبان نے ان کی عبارتوں کو ادب پارہ بنادیا ہے، حضرت امام حسینؓ کی ولادت کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''ریاض نبویؐ میں وہ خوش رنگ ارغوانی پھول کھلا جس کی مہک حق و صداقت، جرأت و بسالت، عزم و استقلال، ایمان و عمل اور ایثار و قربانی کی وادیوں کو ابدالآباد تک بساتی اور حسن کی رنگینی عقیق کی سرخی، شفق کی گلگونی اور لالہ کے داغ کو شرماتی رہے گی یعنی ۴ھ میں علیؓ کا کاشانہ حسینؓ کے تولد سے رشک گلزار بنا۔'' (۱)

حضرت حسن بصریؒ کے تذکرہ میں ان کے زہد و ورع، خشیت الٰہی اور ان کے خوف خدا کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''خشیت الٰہی کا اس قدر غلبہ رہتا کہ ہر آن لرزاں رہتے تھے، یونس بن عبید کا بیان ہے کہ جب حسنؒ آتے تو معلوم ہوتا کہ اپنے کسی عزیز قریب کو دفن کیے ہوئے آرہے ہیں، جب بیٹھتے تو معلوم ہوتا کہ وہ ایسے قیدی ہیں جس کی گردن مارے جانے کا حکم دیا جاچکا ہے اور جب دوزخ کا ذکر کرتے تھے تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ دوزخ صرف انہی کے لیے بنائی گئی ہے اس پر سوز بلکہ پر کیف فطرت کا نتیجہ تھا کہ ان کی زندگی سرتاپا زہد و ورع میں ڈوبی ہوئی تھی، ان کی ذات عبادت و ریاضت اور زہد و ورع کا مجموعہ تھی۔'' (۲)

حضرت اویس قرنیؒ کے زہد و تقویٰ اور ان کی طرز معاشرت کی منظر کشی ملاحظہ ہو۔

''زہد کا یہ عالم تھا کہ گھربار لباس اور کھانے پینے وغیرہ جملہ علائق دنیاوی سے ہمیشہ آزاد رہے، ایک نہایت بوسیدہ اور شکستہ مکان میں رہتے تھے، کھانے پینے کا یہ حال تھا کہ کبھی اونٹ چرا کر اور کبھی کھجور کی گٹھلیاں بیچ کر قوت لایموت حاصل کرتے تھے، حضرت عمرؓ نے سلوک کرنا چاہا مگر انکار کردیا، لباس میں ایک صوف کی چادر اور ایک صوف کا ازار ہوتا تھا اور اکثر وہ بھی میسر نہ آتا تھا، لوگ ننگے بدن دیکھ کر چادر دے دیتے، پیٹ کے کھانے اور بدن کے کپڑے کے علاوہ کوئی چیز پاس نہ رکھتے تھے، فرمایا کرتے تھے'' خدایا! میں تجھ سے بھوکے جگر اور ننگے بدن کی معذرت چاہتا ہوں، لباس جو میرے جسم پر اور غذا جو میرے پیٹ میں ہے اس کے علاوہ میرے پاس اور کچھ نہیں۔'' (۳)

شاہ صاحب، صاحب تذکرہ کے اقوال بھی نقل کرتے جاتے ہیں جس سے خود صاحب تذکرہ کی زندگی اور ان کے اعمال وافکار کو سمجھنے میں اور آسانی ہوتی ہے اور اس کے علاوہ موضوع کی ہم آہنگی اور منطقی ربط بھی ان کے تذکروں کی بڑی خوبی ہے۔

اس طرح شاہ صاحب ولادت سے وفات تک کے تمام حالات وواقعات جس میں تعلیم وتربیت، درس وتدریس، تصنیف وتالیف، تبلیغ دین، ذاتی اور نج کے حالات وغیرہ کی تفصیل ہوتی ہے قلم بند کردیتے ہیں البتہ اختصار اور جامعیت ان کے تذکروں کی بڑی خوبی ہے نہ اس میں اس قدر اطناب ہوتا ہے کہ طبیعت اکتا جائے اور نہ اس قدر اختصار کہ تشنگی دوچند ہوجائے اور یہی وہ امتیاز ہے جو شاہ صاحب کو ہم عصر تذکرہ نگاروں میں ممتاز کرتا ہے۔

☆☆☆☆☆

حواشی

(۱) سیر الصحابہ جلد ششم ص ۱۴۵۔۱۴۶

(۲) تابعین ص ۸۵

(۳) ایضاً ص ۱۴۲



(باب چہارم)

بحیثیت ادیب ونقاد

شاہ صاحب کا تعلق اردو کے قدیم شرفا کے خانوادے سے تھا جس کی پاکیزہ ادبی، تہذیبی روایات میں ان کی پرورش ہوئی، اعلیٰ تعلیم بھی فرنگی محل اور ندوہ سے حاصل کی جو گہوارۂ تہذیب وتمدن لکھنؤ کی خصوصیات بھی اپنے جلو میں لیے ہوئے تھا، دارالمصنفین آئے تو علامہ سید سلیمان ندوی جیسے ادیب ونقاد کے زیر سایہ تصنیف وتالیف کا قابل رشک موقع ملا، ان کے علاوہ مولانا عبدالسلام ندوی صاحب اقبال کامل وشعر الہند جیسے ادیب شہیر کی تربیت وہدایت سے بھی مستفید ہوئے، غرض یہ کہ شاہ صاحب کو شروع ہی سے وہ ماحول میسر آتا گیا جس سے ان کے ادبی ذوق اور انشا پردازی کو جلا ملتی رہی یہی وجہ ہے کہ جب سید صاحب نے انھیں سیر الصحابہ کی تدوین وتالیف کے لیے منتخب کیا تو بعض لوگوں نے اس کے بجائے ان سے شعروادب پر کام لینے کا مشورہ دیا۔(۱)

لیکن سیر الصحابہ اور تاریخ اسلام نے ان کی مؤرخانہ ومحققانہ حیثیتوں کو ثابت کردیا، یہ اور بات ہے کہ ان کی تاریخی کتابوں کی ادبی چاشنی شاہ صاحب کے فطری ذوق کی اضافی خوبی ہوگئی۔

انھیں زبان وبیان پر مکمل عبور حاصل تھا، وہ نہایت شستہ اور شگفتہ نثر لکھتے تھے، اس کی صحت وسقم پر ان کی پوری نظر تھی بلکہ سچ تو یہ ہے کہ زبان کے سلسلہ میں ان کو سند کا درجہ حاصل تھا، مولانا سید ابوالحسن ندویؒ لکھتے ہیں:

''وہ زبان و ادب ، الفاظ ومحاورات کے استعمال اور زبان کی صحت وسقم کے بارے میں سند کا درجہ رکھتے تھے اور اب تھوڑے ہی لوگ زبان کی نوک پلک اور اس کے مزاج سے اتنے واقف ہوں گے جتنے وہ تھے۔''(۲)

بحیثیت ادیب و نقاد اور اردو و فارسی کے مزاج داں اور ادب شناس کے ان کی جداگانہ شان ان کے وقیع ادبی مضامین سے ظاہر ہے جو ماہنامہ معارف اور رسالہ ہندوستانی الہ آباد کے صفحات کی زینت ہیں تاہم یہ عجیب بات ہے کہ شاہ صاحب نے کوئی مستقل ادبی تصنیف یادگار نہیں چھوڑی البتہ ادبی نقوش کے نام سے ان کے مضامین کا مجموعہ بہر حال ایک مستقل تصنیف کی کمی کو پورا کرتا ہے۔

ان کی نثر بڑی پاکیزہ اور تغزل سے بھر پور ہے وہ اس میں غنائیہ فضا پیدا کر دیتے ہیں اور پڑھنے والا اس کے سحر کی داد دیئے بغیر نہیں رہ سکتا، ریاض خیر آبادی کے مجموعہ کلام ''ریاض رضواں'' پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''دیوان کیا ہے میکدہ ہے، غزلوں میں شراب کی تاثیر اور ہر شعر چھلکتا ہوا جام ہے اس لیے جوں جوں آگے بڑھتا گیا افسردہ طبیعت شگفتہ ہوتی گئی اور شاعری سے مدتوں اکھڑی ہوئی طبیعت عارضی طور سے پھر مانوس ہوگئی، یہ بھی حسن اتفاق ہے کہ اس میکدہ کی سیر کا اتفاق عین توبہ شکن موسم ساون میں ہوا...... میکدہ ریاض کی شراب اتنی تیز اور رنگین ہے کہ اسے پی کر نہ بہکنا بڑے ظرف کا کام ہے اس سے اگر سنجیدہ ناظرین کو کہیں قلم میں لغزش نظر آئے تو وہ میرا قصور نہیں بلکہ بادۂ ہوش ربا کا فیض ہے۔''(۳)

شاہ صاحب کی تاریخ اردو ادب پر بڑی گہری نظر تھی، وہ اس کے عہد بہ عہد ارتقا تغیرات وانقلابات اور جدید وقدیم رجحانات سے اچھی طرح واقف تھے، فانی کے مجموعہ کلام ''باقیات فانی'' پر تبصرہ کرتے ہوئے بطور تمہید لکھتے ہیں:

"آزاد، حالی اور اکبر شاعری کی دوسری صنفوں کو مثلاً قصائد، قطعات، رباعیات کو قدیم طرز کے تنگ کوچہ سے آزاد کر کے جدید طرز شاعری کے وسیع میدان میں لے آئے مگر غزل میں آکر یہ بوڑھے بھی اپنی عشق ومحبت کی قدیم داستانوں کو نہ بھلا سکے اور اپنی جوانی کی روداد حسن وعشق کے اظہار میں کوئی تاویل، تحریف اور تغیر مناسب نہ سمجھی، نوجوان اقبال نے جدید تعلیم وخیالات کے زور سے اپنے لیے نیا راستہ نکالا......غزل کی دنیا میں انقلاب درحقیقت حسرت نے پیدا کیا اگر وہ قید خانہ کی بیکاری میں کام پیدا کرنے کے لیے شاعری نہ کیا کرتے تو ان کی اولیت کے نمبر کو کوئی مٹا نہیں سکتا تھا، جوہر کا حال ان سے مختلف رہا ان کو زلیخائے شاعری کا دیدار زندان یوسف میں نظر آتا رہا، جب باہر آئے تو مصر قومی کے قحط کے بندوبست سے ان کو فرصت نہ ملی، حسرت کے بعد عزیز، فانی، اصغر، جگر نے موسم کے اس تغیر کو بالکل نمایاں کر دیا اور غزل کی زمین پر گل و ریاحین کے بدلے نئے نئے رنگ اور نئے نئے پھول کھلائے۔"(۴)

یہ مثالیں تو خالص ادبی موضوعات پر ان کی دلکش و دلفریب نثر کے حوالے سے ہیں خوش گوار حیرت اس وقت اور افزوں ہو جاتی ہے جب تذکرہ وسوانح اور تاریخ میں بھی وہ اسی طرح رعنائی وزیبائی، گل کاری ورنگینی کا منظر پیش کرتے ہیں جس کی مثالیں ہم اوپر پیش کر چکے ہیں۔

اس کے علاوہ معارف کے شذرات میں موجودہ حالات وسیاسیات پر تبصرے میں بھی ان کا قلم زبان وادب کے موتی بکھیرتا ہے، ڈاکٹر کھرے جیسے متعصب اور فرقہ پرست نے اسلام پر الزام لگایا کہ وہ دنیا کے لیے خطرہ ہے تو شاہ صاحب نے اس کا سخت نوٹس لیا اس کی زبان وادا اور طرز بیان ملاحظہ ہو۔

"اگر اسلام دنیا کے لیے خطرہ ہوتا اور اس کا شعار جارحانہ ہوتا تو آج ہندوستان تہذیب وتمدن کے اس درجہ پر نہ ہوتا اور نہ اسلام کے خلاف

زہر چکانی کے لیے ڈاکٹر کھرے کا وجود ہوتا ان کے اسلاف یا اسلام قبول کر چکے ہوتے یا اس کے جارحانہ شعار کا شکار ہو گئے ہوتے ان کا وجود خود ان کے دعویٰ کی تردید کے لیے کافی ہے اسلام سرنگوں کب تھا جواب سر اٹھانے کوشش کر رہا ہے، وہ ہمیشہ سربلند رہا اور آئندہ بھی رہے گا وہ ہندوستان کی چہار دیواری میں محدود نہیں بلکہ ساری دنیا میں پھیلا ہوا ہے، ڈاکٹر کھرے کہاں کہاں اس کا مقابلہ کرتے پھریں گے۔

پھونکوں سے یہ چراغ بجھایا نہ جائے گا۔ (۵)

ادیب صرف ادیب ہو اور اس کی نظر ادب کے حسن وقبح پر نہ ہو تو وہ ادب وانشا کی لالہ کاری تو دکھا سکتا ہے لیکن اس کے ادب میں فن کے وہ لازوال نقوش نہ مل سکیں گے جو بہترین اور اعلیٰ ادب کے لیے ضروری ہوتے ہیں، شاہ صاحب ادیب وانشا پرداز ہونے کے ساتھ ایک بالغ نظر اور صاحب شعور نقاد بھی تھے، انہوں نے جگر، اصغر، فانی، اثر، مجذوب اور یحییٰ اعظمی وغیرہ کے کلام پر جو نقد وتبصرہ کیا ہے ان سے ان کی تنقیدی فہم وبصیرت کا اندازہ ہوتا ہے۔

ان کی یہ تنقیدی تحریریں قدیم مشرقی تنقید کا نمونہ ہیں فنی لحاظ سے ان کی تنقید کو جمالیاتی اور تاثراتی تنقید قرار دیا جا سکتا ہے وہ شعر کے ظاہری اور معنوی حسن کو شعر کی روح تصور کرتے تھے۔ ظاہری اعتبار سے صحیح الفاظ اور جملوں کا انتخاب اور ان کا استعمال شاہ صاحب کے نزدیک شعر کا لازمی جزو ہے، وہ لکھتے ہیں:

> ''شعر کی تاثیر کے لیے سب سے مقدم شرط الفاظ کا مناسب انتخاب اور ان کا صحیح استعمال ہے، سامعہ کا سب سے پہلا اثر الفاظ کی شیرینی اور اس کے ترنم کا پڑتا ہے معنی پر بعد میں نظر جاتی ہے، معنوی حیثیت سے شعر کا مفہوم کتنا ہی بلند کیوں نہ ہو لیکن اگر الفاظ شیریں اور ترکیب مترنم نہیں تو شعر بالکل پست ہو جائے گا اور سننے والے پر ان کا کوئی خاص اثر نہ پڑے گا اس کے برعکس سادہ سے سادہ تخیل کو الفاظ کی سحر کاری کہیں سے کہیں پہونچا دیتی ہے۔ (۶)

شعر میں سادگی، شیرینی، ترنم اور سحر کاری کے ساتھ شاہ صاحب سلاست و روانی کو بھی لازم قرار دیتے ہیں خیالات کی نزاکتوں اور دقت ادا کی خوبیوں سے بھرپور سلاست و روانی کو وہ شعر کا جوہر تصور کرتے ہیں، ان کے نزدیک شعر کی سب سے بڑی ظاہری خوبی یہ ہے کہ اگر اسے نثر کرنا ہو تو اس کی ترکیب میں کوئی فرق نہ ہو اور نہ اس سے کسی لفظ یا جملے کو نکالنے کی ضرورت پیش آئے (۷) اور لطف زبان بھی متاثر نہ ہو اور لطف زبان کیا ہے اس کا مفہوم خود ان کی زبان سے ملاحظہ ہو، وہ لکھتے ہیں کہ:

> ''لطف زبان سے مراد وہ مخصوص اور ٹکسالی محاورے ہیں جو اردو کے مرکزوں کی گلیوں میں بولے جاتے ہیں میرے نزدیک زبان کی خوبی کے لیے صرف اس قدر کافی ہے کہ اس میں صرفی، نحوی خامی نہ ہو محاورے کے خلاف نہ ہو، انداز بیان میں فصاحت اور دلکشی ہو اگر کلام اس معیار پر ٹھیک اترتا ہے تو پھر اس کی خوبی کے لیے اور کسی عنصر کی ضرورت نہیں۔'' (۸)

لطف زبان کے لیے وہ سادگی و پرکاری کے ساتھ فارسی کے شیریں الفاظ و محاورات اور اس کی ترکیبوں کے استعمال کو بھی ضروری قرار دیتے ہیں۔ سید صباح الدین عبدالرحمن مرحوم نے لکھا ہے کہ:

> ''شاہ صاحب کو شاعری میں صحت زبان انتخاب الفاظ اور بلاغت ادا کا بڑا خیال رہتا ان کی دلیل یہ تھی کہ گو حسن ہر لباس میں حسن ہے لیکن ظاہری لباس کی خوبی حسن کو اور دوبالا کر دیتی ہے ہمارے خیال میں کوئی صاحب مذاق حسن کو گدڑی میں دیکھنا اور شراب انگور کو بلور میں ساغر کے بجائے جام سفال میں پینا پسند نہ کرے گا۔ (۹)

شاہ صاحب کے مذکورہ بالا خیالات سے یہ مفہوم ہرگز نہیں نکالنا چاہیے کہ وہ شعر کے صرف ظاہری حسن کو ہی اس کی اصل خوبی سمجھتے تھے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ وہ ظاہری خوبیوں کے ساتھ معنوی اور باطنی خوبیوں اور کیفیات کے بھی قائل ہیں۔ شعر کے مفہوم میں وحدت و یک

رنگی، انداز بیان میں تنوع اور طریقہ ادا کی نیرنگی اور خیالات کی یکسانیت بھی ان کے نزدیک کلام کی خوبیاں ہیں ان کا خیال ہے کہ خیالات میں بلندی ہونی چاہیے اور گرے ہوئے خیالات کو شعر میں جگہ نہیں دینی چاہیے، سوز و گداز بھی خوبیٔ کلام کا عنصر ہے اور اسی کو وہ تغزل کی روح بتاتے ہیں، وہ لکھتے ہیں:

''سوز و گداز تغزل کی روح ہے اسی سے تغزل کے جسم میں جان پڑتی ہے، گداز عشق سے خالی تغزل ایک شراب بے کیف ہے، اس لیے کہ تغزل نام ہے حسن و عشق کی واردات کی مصوری کا اور سوز و گداز ہی عشق میں جلا دیتا ہے اور اسی برق خرمن سوز سے نخل عاشقی ہرا ہوتا ہے۔'' (۱۰)

شاہ صاحب اپنے ان ہی اصولوں کی روشنی میں شعری تخلیقات کو ہدف تنقید بناتے ہیں اگر مذکورہ بالا خوبیاں یعنی حسن ظاہری و معنوی نہ پائی جائیں تو وہ کلام میں سقم اور قبح کی دلیل ہیں مثلاً سرود زندگی پر تبصرہ کرتے ہوئے وہ اصغر کی خوبیوں کے اعتراف کے ساتھ ان کے سب سے بڑی ظاہری خامی جملوں کی بے ترتیبی اور طرز ادا کی ناہمواری کو قرار دیتے ہیں معنوی خامی، پرواز تخیل میں مرغ خیال کا کہیں کہیں بھٹک جانا بتاتے ہیں اور لکھتے ہیں:

''دوسری خامی معنوی ہے اس میں شبہ نہیں جہاں تک خیالات کا تعلق ہے اصغر صاحب نے نمایاں ترقی کی ہے اب ان کے خیالات رفعت و بلندی اور لطافت و پاکیزگی کی معراج کمال تک پہونچ گئے ہیں مگر اب اس پرواز میں ان کا مرغ خیال کہیں کہیں بھٹک جاتا ہے وہ ندرت خیال اور اسرار تصوف کی دھن میں کبھی کبھی ایسے خیالات بھی پیدا کرتے ہیں جن کا ان کے ذہن کے سوا اور کوئی وجود نہیں، اس میں شبہ نہیں کہ عارفانہ حقائق ان کی شاعری کا امتیازی وصف ہیں لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ ہر ایسے پر پیچ اور ذہنی خیال کو جس کی نزاکت معنی کی بھی متحمل نہ ہو سکے تصوف کا کوئی دقیق نکتہ سمجھ لیا جائے محض صوفیانہ خیال یا صوفیانہ مصطلحات کی آمیزش سے کوئی ''خیال محض''

بامعنی حقیقت نہیں بن سکتا، اس دقت پسندی کی وجہ سے اصغر صاحب کے
بعض اشعار بالکل بے معنی ہو کر رہ گئے ہیں اور عرب کاہنوں کی نثر معلوم
ہوتے ہیں۔'(۱۱)

اس طویل اقتباس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ شاہ صاحب ظاہری ومعنوی خوبیاں ہر شعر میں تلاش کرتے ہیں اور انہیں کی بنیاد پر حسن وقبح اور کھرے وکھوٹے کا فیصلہ کرتے ہیں، ظاہر ہے یہ اصول قدیم تنقید کے ہیں اور شاید اسی وجہ سے ان کے ادبی مضامین کو قدیم تنقید کا نمونہ قرار دیا جاتا ہے۔(۱۲) یہاں اس کی چند مثالیں نقل کی جاتی ہے۔

(۱) ظاہری خامیوں کی نشاندہی اس طرح کی ہے، اصغر کا شعر ہے۔

ازل میں اک تجلی سے ہوئی تھی بے خودی طاری
تمہیں کو میں نے دیکھا تھا کچھ ایسا یاد ہوتا ہے

اس پر تبصرہ کرتے ہوئے شاہ صاحب لکھتے ہیں:

'' 'یاد ہوتا ہے' صحیح نہیں، 'یاد آتا ہے' ہونا چاہیے محض ردیف کی
پابندی کی وجہ سے یہ تصرف کیا گیا ہے۔''(۱۳)

اثر صہبائی کا مصرعہ ہے۔

بجلیاں تھیں بھری ہوئی زمزمہ رباب میں

اس پر نقد کرتے ہوئے شاہ صاحب لکھتے ہیں:

''وزن کے لحاظ سے بجلیاں کا تلفظ صحیح نہیں ادا ہوتا اگر اسے 'برق
تھی کون سی بھری' سے بدل دیا جائے تو یہ نقص دور ہو جائے گا۔''(۱۴)

اصغر کا ایک اور شعر ہے۔

ہے خرد کی، عشق کی دونوں کی ہستی پر نظر
یہ شہید نغمہ ہے وہ مبتلائے ساز ہے

اس پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اس شعر سے یہ صاف نہیں معلوم ہوتا ہے کہ شاعر خرد اور عشق کی
تحقیر کرنا چاہتا ہے یا عشق کو خرد پر ترجیح دینا چاہتا ہے یا دونوں کی حقیقت بتانا
چاہتا ہے، قیاس سے معلوم ہوتا ہے کہ دونوں کی حقیقت سے باخبر کرنا مقصود
ہے کہ ایک شہید نغمہ ہے اور دوسرا ابتلائے ساز ہے لیکن ہستی پر نظر سے یہ
مطلب واضح نہیں ہوتا، اسے یوں کہنا چاہیے:

ہے خرد اور عشق دونوں کی حقیقت پر نظر

اس سے ایک مصرعہ میں تین تین کی کے اجتماع کا عیب بھی جاتا
رہے گا۔'' (۱۵)

(۲) معنوی خامیوں کی نشاندہی کی مثالیں ملاحظہ ہوں، ریاض خیرآبادی کے مجموعہ کلام 'ریاض رضواں' پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''ریاض کمال فن کے ساتھ خوش مذاق بھی تھے لیکن جس دور اور
جس اسکول کے وہ شاعر تھے اس میں تخیل کا ابتذال، جذبات کی عریانی،
معاملہ بندی، خارجی اوصاف کی مصوری، الفاظ کی رکاکت، صنائع لفظی اور
اس قبیل کی دوسری باتیں شاعری کے حقیقی اجزاء وعناصر بلکہ کمال شاعری سمجھی
جاتی تھیں اس لیے ریاض خوش مذاقی کے باوجود ان عیوب سے اپنا دامن بچا
نہ سکے اور کم وبیش ان سب کی مثالیں ان کے کلام میں موجود ہیں اور تخیل اور
جذبات کی تو ایسی عریاں تصویریں ہیں کہ انہیں جلوت کیا خلوت میں بھی
دیکھنا مشکل ہے۔'' (۱۶)

اصغر کا ایک شعر ہے۔

جہاں کی خیر ہو جان حزیں کی خیر ہو یارب
کہ لو اونچی ہوئی جاتی ہے اب سوز محبت کی

اس شعر پر نقد کرتے ہوئے شاہ صاحب نے پہلے ظاہری خامیوں کی نشاندہی کی ہے، پھر معنوی

خامی پر یوں روشنی ڈالی ہے۔

''معنوی اعتبار سے یہ خرابی ہے کہ ایک عاشق جاں باز کے لیے سوز محبت کی زیادتی پر جان کی خیر منانا شان عشق سے بعید ہے، اس کا کام تو یہ ہے کہ سوز عشق میں جل کر خاکستر ہو جائے اور منہ سے اف نہ نکلے۔'' (۱۷)

غرض یہ کہ شاہ صاحب ایک بڑے ادیب و نقاد تھے اور نثر و نظم کے حسن و قبح پر ان کی گہری نظر تھی اور اسی وجہ سے تذکرہ نگار اور مؤرخ کے ساتھ انھیں ایک بڑا ادیب و نقاد تسلیم کیا جاتا ہے۔



حواشی:

(۱) ماہنامہ معارف مارچ ۱۹۸۱ء، ص ۱۸۶
(۲) تعمیر حیات لکھنؤ (شاہ معین الدین احمد ندوی نمبر) ص ۴
(۳) ادبی نقوش ص ۲۱۴-۲۱۵
(۴) ایضاً ص ۲۶۲
(۵) ماہنامہ معارف شذرات مارچ ۱۹۵۱ء، ص ۱۶۲
(۶) ادبی نقوش ص ۱۷۶
(۷) ایضاً ص ۱۷۸
(۸) ایضاً ص ۱۸۰
(۹) ماہنامہ معارف اگست ۱۹۸۱ء، ص ۱۰۶
(۱۰) ادبی نقوش ص ۷۵
(۱۱) ادبی نقوش ص ۲۷۲-۲۷۳
(۱۲) تعمیر حیات لکھنؤ (شاہ معین الدین احمد ندوی نمبر) ص ۲۸
(۱۳) ادبی نقوش ص ۲۷۴
(۱۴) ماہنامہ معارف فروری ۱۹۳۴ء
(۱۵) ادبی نقوش ص ۲۷۴
(۱۶) ایضاً ص ۲۴۳
(۱۷) ایضاً ص ۲۷۷



(باب پنجم)

بحیثیت مؤرخ

شاہ صاحب کی علمی شخصیت کا ایک اہم پہلو ان کا تاریخی شعور اور مؤرخانہ فہم و بصیرت ہے، انھوں نے تاریخ کے موضوع پر تاریخ اسلام جیسی اہم کتاب لکھی جو ان کی تاریخ نویسی کا نمونہ قرار دی جاسکتی ہے اور ان کی دوسری کتاب ''عرب کی موجودہ حکومتیں'' بھی اسی زمرہ میں آتی ہے، اس کے علاوہ تاریخ سے متعلق دارالمصنفین کی دیگر تصنیفات کے لیے انھوں نے جو مقدمے اور دیباچے تحریر کئے وہ مختصر ہونے کے باوجود ان کی تاریخ شناسی اور اس فن پر ان کے عبور کا پتہ دیتے ہیں، حتی کہ وہ کتابیں جو باضابطہ تاریخ نگاری کے فن میں نہیں آتیں، ان میں بھی جگہ جگہ تاریخی عناصر کی موجودگی اس بات کا ثبوت ہے کہ ان کی فکر ونظر تاریخی تجزیہ و استدلال سے مربوط تھی اور ایسا ہونا فطری بھی تھا کیونکہ وہ سید صاحب جیسے مؤرخ کے تربیت یافتہ اور دبستان شبلی کے ترجمان تھے، یہاں ان کی تاریخ نگاری کی چند خصوصیات کا ذکر کیا جاتا ہے۔

ایک جامع و مکمل تاریخ کے لئے ضروری ہے کہ اس میں زیر تحریر عہد کے ہر طرح کے حالات لکھے جائیں، مثلاً ان میں حکمرانوں کی فتح و شکست، تخت نشینی اور معزولی کے ساتھ اس عہد کے عام حالات نیز مذہبی، اخلاقی، اقتصادی، معاشرتی اور علمی حالات بھی لکھے جائیں، چنانچہ شاہ صاحب نے اپنی تاریخی تصانیف خصوصاً تاریخ اسلام کی چاروں جلدوں اور ''عرب کی موجودہ حکومتیں'' میں اس اصول کا پوری طرح پاس و لحاظ بھی رکھا ہے جہاں انہوں نے عہد رسالت، خلافت راشدہ، بنوامیہ اور بنوعباس کے سیاسی حالات لکھے ہیں، وہیں ان ادوار کی

علمی و تعلیمی اور تہذیبی و تمدنی تصویر بھی پیش کی ہے، درحقیقت انہوں نے تمدنی تاریخ پر خاص طور سے توجہ دی ہے، تاریخ اسلام کی اس خصوصیت کا مولانا سید سلیمان ندویؒ نے بطور خاص ذکر کیا ہے، وہ لکھتے ہیں:

''اس پورے سلسلہ میں اسلام کے اخلاقی اثرات اور مسلمانوں کی تمدنی تاریخ کو خاص طور سے پیش نظر رکھا گیا ہے۔ یعنی اسلام سے پہلے دنیا کی اخلاقی حالت کیا تھی، اسلام نے کیا سبق دیا، اپنی تعلیم کے اس نے کیسے نمونے پیدا کئے، مسلمانوں نے خود کہاں تک اس تعلیم پر عمل کیا اور دوسروں کے ساتھ کہاں تک اس کو برتا، دنیا پر اس کے اثرات کیا پڑے اور انسانیت کو اس سے کیا فوائد پہنچے، مسلمانوں نے علم وفن کی کیا خدمت کی اور انسانی تہذیب وتمدن کا قدم کہاں سے کہاں تک پہنچایا۔'' (۱)

کسی واقعہ کے بارے میں اختلاف اور تضاد کا امکان تاریخ نگار کے پیش نظر رہتا ہے اس صورت میں اس کا فرض ہے کہ واقعہ کی صحت کی تعیین کے بعد ہی اسے تحریر کرے، اس اصول کو تقریباً تمام اسلامی مورخین نے تاریخ نگاری کے لیے ضروری قرار دیا ہے، شاہ صاحب نے بھی صحت وصداقت کا اپنی تاریخوں میں خاص لحاظ رکھا ہے اور جو کچھ لکھا ہے وہ معتبر ومستند ماخذوں سے لکھا ہے، انہیں کے الفاظ میں ''ہر حکومت کے حال میں حتی الامکان مستند ترین عربی وفارسی ماخذوں سے استفادہ کیا گیا ہے۔'' (۲)

اس اصول کی پاسداری کا اندازہ کتاب کے حوالوں سے بھی لگایا جاسکتا ہے، جو صفحہ صفحہ پر کثرت سے دیئے گئے ہیں، البتہ کتاب میں یہ بحث اکثر درج نہیں کی گئی ہے کہ جو واقعہ نقل گیا گیا ہے وہ کیونکر صحیح ہے اور جسے قبول نہیں کیا گیا ہے وہ کیوں سچ نہیں تھا، یہ عذر کہ اسے طوالت کے خوف سے نظر انداز کیا گیا ہے مناسب نہیں، جہاں یہ تفصیلات موجود ہیں ان کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ صحت واقعہ میں روایت و درایت کے اصولوں کو بروئے کار لایا گیا ہے اس خوبی کا ذکر مولانا سید سلیمان ندوی نے بھی کتاب کے مقدمہ میں کیا ہے۔ (۳)

شاہ صاحب نے واقعات کے اسباب وعلل کا بھی سراغ لگایا ہے مثلاً بنوامیہ کے عروج وزوال کے اسباب یا دولت عباسیہ کے عروج وزوال کے اسباب وغیرہ، شاہ صاحب نے تفصیل سے تاریخ کے ان پوشیدہ رازوں کو تلاش کرنے کی سعی کی ہے، حتیٰ کہ ضمنی واقعات میں بھی یہی انداز ہے، مثلاً ابن سبا کی فتنہ انگیزی اوراس کی وقتی کامیابی کے اسباب بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''یہودیوں کے بعد مسلمانوں کے دوسرے دشمن اہل عجم تھے جن کی حکومت انہوں نے مٹائی تھی ان کی فطرت میں شاہ پرستی تھی، ابن سبا اہل بیت کے داعی کے لباس میں تھا اس لیے سرزمین عجم میں اس کی تحریک کو بڑا فروغ ہوا گو عجمیوں کا نقطۂ نظر اس سے مختلف تھا، ابن سبا کا مقصد مسلمانوں کا شیرازہ درہم برہم کرنا تھا اور اہل عجم چاہتے تھے کہ اسلامی خلافت ایسے موروثی قالب میں ڈھل جائے کہ ان کی خدمات یعنی حمایت اہل بیت کے صلہ میں ان کو حکومت میں زیادہ سے زیادہ حقوق حاصل ہوجائیں، اس لیے عراق وغیرہ میں ابن سبا کی تحریک زیادہ بارآور ہوئی۔

ان طبقوں کے علاوہ بعض مخلص مسلمان بھی اس کے فریب میں اس طرح آگئے کہ بعض نوجوان عثمانی عمال میں جو عہد سعادت کے فیض تربیت سے محروم تھے صحابہ کرامؓ کے جیسا اخلاص وتدین نہ تھا پھر حضرت عثمانؓ میں فاروقی صولت نہ تھی جس سے بڑے بڑے مدبرین اور فتنہ پرست تھراتے تھے بلکہ آپ فطرۃً نہایت نرم خو، حلیم الطبع اور متحمل مزاج تھے، آپ میں عفو ودرگذر کا مادہ زیادہ تھا اس لیے آپ کے عمال سے جو بے عنوانیاں سرزد ہوتی تھیں گو علم کے بعد آپ ان کا پورا تدارک کرتے تھے لیکن بہت سی باتیں علم ہی میں نہ آتی تھیں اور بعض بے عنوانیوں میں اپنی فطری نرمی کی بناپر چشم پوشی بھی کرتے تھے، اس سے مخالفین کو بدنام کرنے کا موقع بہرحال مل

جاتا تھا اس لیے بعض مخلص اور خیر خواہ خلافت سادہ مزاج بزرگوں کے دلوں میں بھی شکوک پیدا ہو گئے۔

ابن سبا نے دعاۃ کے ذریعہ اور تحریری پروپگنڈہ کے علاوہ خود عراق اور مصر وغیرہ جا کر خفیہ جماعتیں قائم کیں، سب سے اول ۳۳ھ میں عبداللہ ابن عامر والئ بصرہ کو اس سازش کا علم ہوا، انہوں نے اس کو اپنے یہاں سے نکالا، یہاں سے نکل کر وہ کوفہ پہنچا، کوفہ سے بھی نکال دیا گیا تو آخر میں مصر کو اپنا مستقر بنایا۔

غرض مذکورہ اسباب کی بنا پر قریب قریب ہر جگہ ابن سبا کے پروپگنڈے کا کچھ نہ کچھ اثر پڑ گیا خصوصاً عراق جس میں مختلف قوموں کی مخلوط آبادی کی وجہ سے شر و فساد کی فطری صلاحیت تھی اس فتنہ کا مرکز بن گیا، چنانچہ کوفہ اور بصرہ میں علانیہ حضرت عثمانؓ کے مخالف پیدا ہو گئے۔"(۷)

واقعات کے اسباب و علل کے ذریعہ تاریخوں میں تسلسل پیدا کرنے کے لیے مورخ کو قیاس واستنباط سے کام لینا ہوتا ہے اس میں یہ احتیاط بھی ضروری ہے کہ اصل واقعہ اور قیاس آپس میں گڈمڈ نہ ہو جائیں اس نقطہ نظر سے جب ہم شاہ صاحب کی تحریروں کا مطالعہ کرتے ہیں تو واضح طور پر یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ شاہ صاحب نے اصل واقعہ اور قیاس میں فرق کیا ہے ان کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ انہوں نے قیاس واجتہاد سے تاریخ کی گم شدہ کڑیوں کو جوڑنے کی کوشش مضبوط دلائل اور قرین قیاس پس منظر کے ساتھ مستند ترین ماخذوں سے کی ہے اسی لیے انہوں نے تاریخ اسلام کی چاروں جلدوں کے علمی وسیاسی واقعات پر سیر حاصل تبصرے کئے ہیں۔

تاریخ سے متعلقہ علوم سے مورخ کا واقف ہونا ضروری ہے کیوں کہ اگر وہ ان علوم میں درک نہ رکھتا ہوگا تو وہ اصل واقعہ تک رسائی نہ حاصل کر سکے گا، راقم الحروف بلا جھجک یہ کہہ سکتا ہے کہ شاہ صاحب کی کتابوں میں یہ خوبی بھی موجود ہے، مثلاً اموی دور کی تاریخ لکھتے

ہوئے شاہ صاحب نے اس عہد کی شاعری پر روشنی ڈالی ہے جس سے عربی شاعری کے ان کے مطالعہ اور خود فن شاعری کے اصول سے ان کی باخبری کا اندازہ ہوتا ہے، وہ لکھتے ہیں:

''خلفائے راشدینؓ کے زمانہ میں گو شاعری کا مذاق قائم رہا تھا لیکن اخلاقی پابندی کی وجہ سے ان کا پرانا رنگ پھیکا پڑ گیا تھا اور کلام مجید کے اعجاز کے سامنے بھی اس کا زور گھٹ گیا تھا، بنی امیہ کے زمانہ میں خلفائے راشدین کے عہد کی قید و بند ختم ہوگئی اور خود اموی خلفا سخن سنج اور شاعری کے قدرداں تھے ان کی قدردانی کی وجہ سے شاعری کا بازار پھر گرم ہو گیا اور اس میں کمیت و کیفیت دونوں حیثیتوں سے ترقی ہوئی اور بڑے بڑے شعرا پیدا ہوئے چنانچہ اخطل، جریر، فرزدق، اعشیٰ، نابغہ، کمیت وغیرہ فحول شعرا جنہوں نے اسلامی دور کو چمکایا اسی زمانہ میں تھے۔

شاعری کی ترقی میں اس زمانہ کے سیاسی حالات سے بھی مدد ملی اموی عہد میں قبائلی، سیاسی اور مذہبی اختلافات کی وجہ سے علوی، شیعی، عثمانی، خارجی، مختلف مذہبی و سیاسی جماعتیں پیدا ہوگئیں تھیں جو باہم حریف تھیں، عرب میں پروپگنڈے کا بڑا ذریعہ شاعری تھی شعرا کے تیغ زبان کی کاٹ شمشیر آبدار سے کم نہ تھی، اس سے اس زمانہ میں جماعتی شعرا کی بڑی تعداد پیدا ہوگئی تھی نعمان بن بشیر انصاری، یزید بن ربیعہ المعروف بہ ابن مفرغ، یمن بن خریم وغیرہ علویوں کے حامی تھے۔ مسکین، دارمی، عبداللہ بن خارجہ المعروف بہ اعشیٰ اموی تھے، اور طرماح بن عدی بن حطان، عبداللہ بن حجاج، زیبانی خارجیوں اور آل زبیر کے حمایتی تھے۔

ان کے علاوہ ان شعرا کی بھی بڑی تعداد ہے جو کسی پارٹی سے تعلق نہ رکھتے تھے مثلاً جمیل ابن یعمر، عمران بن ابی ربیعہ، عبداللہ بن قیس الرقیات کثیرہ وغیرہ ابن عبادہ، احوص، ذی الرمہ، سعید دارمی، عبید بن حصین،

عبداللہ بن خارجہ اور نسیلی الاغیلبہ وغیرہ۔

کیفیت کے اعتبار سے بھی شاعری کا رنگ بہت نکھرا، بنی امیہ کو عربوں کی خصوصیات کے تحفظ میں بڑا اہتمام تھا اس لیے انھوں نے عربوں کو دوسری قوموں میں ضم نہیں ہونے دیا اور عربی زبان آمیزش سے محفوظ رہی لیکن اس کے تمدنی اثرات سے وہ بچ نہ سکے اس لیے عربی شاعری بھی اس سے متاثر ہوئی اور عراق وشام کے تمدن اور ان کے باغات وسبزہ زاروں نے عربی شاعری کا رنگ بدل دیا اور اس میں عربوں کی سادہ بدویانہ جذبات اور بے آب وگیاہ صحرا کے خشک اور محدود مضامین کے بجائے بڑی تنوع اور رنگینی پیدا ہوگئی اور اس دور کی شاعری خیالات لطافت ورنگینی کے لحاظ سے عرب کی جاہلی شاعری سے بہت بڑھ گئی، قصائد، تغزل اور تشبیب میں اس کا اثر نمایاں نظر آتا ہے۔'' (۵)

اسی طرح تاریخ اسلام کے چاروں حصوں میں سیاسی مباحث میں شاہ صاحب ماہر سیاسیات اور اخلاقی مباحث میں ماہر علم الاخلاق معلوم ہوتے ہیں۔

شاہ صاحب کا ایک نمایاں وصف ان کی مؤرخانہ غیر جانب داری بھی ہے ان کی تصانیف میں یہ معلوم کرنا مشکل ہے کہ انھوں نے کسی حکمراں یا کسی عہد کی تاریخ میں کسی قسم کی جانب داری برتی ہے ان سے ان کا یہ نظریہ بھی سامنے آتا ہے کہ۔

ہم سخن فہم ہیں غالب کے طرفدار نہیں

مثلاً تاریخ اسلام کے چوتھے حصہ میں انھوں نے دولت عباسیہ کی تاریخ لکھی ہے، اس کے تمدن پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

''عباسیوں کے علمی کارناموں کی طرح ان کے تمدنی کارنامے بھی بہت ہیں ظاہری نفاست ولطافت اور حسن ودلآویزی کے اعتبار سے ان کا تمدن نہایت بلند تھا اور محاضرات کی مشہور ومعروف کتاب الف لیلہ ولیلہ

میں اس کی جو تصویریں نظر آتی ہیں ان کو اگرچہ تاریخی اعتبار سے سند کا درجہ حاصل نہیں ہے اور اس میں بہت سے افسانے اور خرافات شامل ہیں لیکن اس سے قطع نظر خالص تمدنی اور معاشرتی مرقعے بڑی حد تک صحیح ہیں۔" (۶)

اس تعریف کے باوجود عباسیوں کے اس پہلو کو بھی بیان کیا ہے:

"بنی امیہ سے بنی عباسؓ کی نفرت وعداوت کا یہ حال تھا کہ آخری اموی فرماں رواں مروان الحمار کی شکست کے بعد خاندان بنی امیہ کے نوے افراد گرفتار ہوئے، یہ غریب کھانے کے لیے جمع کئے گئے، اس وقت بنی ہاشم کے ایک معمولی غلام شبل بن عبداللہ نے بنی امیہ پر اشتعال دلانے والے چند اشعار پڑھ دیئے انھیں سن کر سفاح بانی دولت عباسیہ کے چچا عبداللہ بن علی نے اسی وقت کل اموی قیدیوں کو خیمہ کی چوبوں سے پٹوا کر مروا ڈالا اور نیم بسمل لاشوں کے ڈھیر پر دسترخوان بچھوا کر کھانا کھایا اور فرش کے نیچے سے دم توڑنے والوں کی سسکیوں کی آواز آرہی تھی ان کے علاوہ جہاں جہاں اموی ملے ڈھونڈھ کر قتل کئے گئے، صرف شیر خوار بچے اور وہ لوگ بچے جنھوں نے بھاگ کر اسپین میں پناہ لی۔" (۷)

اسی طرح انھوں نے جس عہد کی تاریخ لکھی یا جس حکمراں کی تاریخ لکھی غیر جانبداری سے لکھی سیاسی اور تمدنی خوبیوں کے ساتھ اس کی خامیوں کو بھی من وعن بیان کر دیا ہے۔ جناب سید صباح الدین عبدالرحمٰن لکھتے ہیں:

"شاہ صاحب نے بنی امیہ کی تاریخ کے تاریک پہلوؤں کو اچھی طرح دکھایا ہے، ایک دیانت دار مورخ کا فرض ہے کہ وہ تاریخ لکھنے میں تاریک پہلوؤں پر پردہ نہ ڈالے، لیکن شاہ صاحب نے بنی امیہ کی تاریخ کے روشن پہلوؤں کو اچھی طرح واضح کیا ہے جس کو پڑھ کر حیرت ہوتی ہے کہ شورشیں اور بغاوتیں ہوتی رہیں اس کے ساتھ فتوحات اور حکومت کی ترقیاں

جاری رہیں۔"(۸)

انفرادی یا شخصی تاریخ میں مورخ کے لیے لازم ہے کہ شخصیت کے اصلی خد و خال نمایاں کردے اور اس میں کسی قسم کی لاگ لپٹ نہ رکھے اور نہ حد اعتدال سے متجاوز ہو، ایسا نہ ہو کہ اس کے معائب سے چشم پوشی کر کے اسے فرشتہ صفت ثابت کردے یا یہ کہ معائب ہی معائب بیان کردے، محققین کا اس سلسلہ میں یہ نقطہ نظر ہے کہ محاسن و معائب یا روشن و تاریک دونوں پہلو بیان کیے جائیں، خود شاہ صاحب لکھتے ہیں:

"دنیا کی حکومت کا دامن خامیوں اور کوتاہیوں سے پاک نہیں اور نہ سب کے سب حکمراں عدل و مساوات کا نمونہ ہوتے ہیں کیا خود اپنی فوجی حکومت کے ہاتھوں اپنے ہم قوم محکوموں کے ساتھ بے عنوانیاں نہیں ہوتیں اور کیا خود اپنی قوم کے ہاتھوں حکومتوں کو نقصان نہیں پہونچے اور کیا عدل و مساوات کا ہر دور جس کو مذہبی تعصب سے خالی کہا جاتا ہے ایسی مثالوں سے خالی ہے ایسی حالت میں کسی حکومت یا حکمراں کے ہر فعل کو محض اختلاف مذہب یا تعصب کا نتیجہ قرار دینا صحیح ہے، بعض بے عنوانیاں حکومت کے ذاتی مصالح، عام سیاسی پالیسی اور مذہب سے قطع نظر ان کی قومی سرشت کا نتیجہ ہوتی ہیں جن کو مذہبی جذبہ سے کوئی تعلق نہیں ہوتا اور جس کا اثر بلا تفریق مذہب تمام محکموں پر پڑتا ہے اس کا یہ مقصد نہیں ہے کہ گزشتہ حکومتوں کے ہر جائز اور ناجائز فعل کو سراہا جائے بلکہ یہ کہ ان کو محض اختلاف مذہب کی عینک سے نہ دیکھا جائے اور ان کی غلطیوں اور بے عنوانیوں کو ان کی حد کے اندر محدود رکھا جائے ان کو آب و رنگ دے کر چمکایا نہ جائے اور ان کی کوتاہیوں کے ساتھ فراخ دلی سے ان کے محاسن کا بھی اعتراف کیا جائے۔"(۹)

چنانچہ شاہ صاحب نے "تاریخ اسلام" میں اس اصول کو بھی برتا ہے مثلاً ولید بن عبدالملک کے عہد حکمرانی کی تاریخ لکھنے کے بعد اس کے دور پر تبصرہ کرتے ہوئے خود شاہ

صاحب نے ولید بن عبدالملک کی متعدد خوبیوں کا ذکر کیا ہے پھر اس کے بارے میں لکھتے ہیں:

''ان تمام خوبیوں کے ساتھ اس میں ایک عیب یہ تھا کہ وہ بڑا سخت گیر تھا اس سخت گیری کی وجہ سے ہزاروں آدمی قید و بند میں مبتلا ہوئے۔''(۱۰)

شاہ صاحب نے کہیں کہیں واضح اور دوٹوک انداز کے بجائے لطیف انداز میں تنقید کی ہے، مثلاً حضرت امیر معاویہؓ کی مذہبی خدمات کے ضمن میں وہ لکھتے ہیں:

''امیر معاویہؓ کی حکومت خلافت راشدہ کے مقابلہ میں خالص دنیاوی تھی، لیکن بہرحال وہ صحابی رسولؐ تھے اس لیے سلطنت کی مادی اور دنیاوی ترقیوں کے ساتھ وہ دین و مذہب کی خدمت سے بھی غافل نہ تھے۔''(۱۱)

مؤرخ جس عہد و ماحول میں رہتا ہے اس کے ذہن و فکر پر اس کا اثر غالب ہوتا ہے اور جب وہ ماضی کے حالات کا تجزیہ کرتا ہے تو بسا اوقات وہ اپنے عہد سے عہد کہن کا موازنہ کر بیٹھتا ہے ظاہر ہے یہ مؤرخ کا ایک نامناسب رویہ ہے شاہ صاحب نے اس سے پوری طرح احتراز کیا ہے۔

شاہ صاحب کی تاریخ نویسی کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ انھوں نے سادہ واقعہ نگاری کی ہے اور فیصلہ نویسی سے احتراز کیا ہے، مثلاً جنگ جمل اور امویوں اور عباسیوں کی تاریخ میں متعدد ایسے نازک واقعات پیش آئے ہیں جن کے لکھنے میں جذبات نوک قلم پر آسکتے ہیں لیکن انھوں نے غیر جانب دار مؤرخ کی طرح کوئی فیصلہ نہیں سنایا۔

تاریخ نویسی کا ایک خاص اسلوب ہے جس میں ادیب کی طرح انشا پردازی شاعروں کی طرح قافیہ پیمائی اور واعظین کی طرح شعلہ بیانی نہیں ہوتی، اس لیے مؤرخ کے لیے سادہ واقعہ نگاری ضروری ہے، شاہ صاحب کے یہاں بھی بے جالفاظی اور مبالغہ آرائی نہیں ہے البتہ ان کی فطری ادبیت کے عناصر ضرور نمایاں ہیں لیکن اس سے نفس واقعہ پر اثر نہیں آتا، مثلاً عباسیوں کے تمدن اور اس کے مظاہر پر انھوں نے اس انداز سے روشنی ڈالی ہے:

''قوموں کے تمدن کا ایک بڑا مظہر اس کی عمارتیں ہیں، ان کا شکوہ وتجمل بانیوں کی شان وعظمت کا نشان اور اس کے نقش ونگاران کے ذوق جمال کی تحریریں ہیں، جن سے ان کی تمدنی تاریخ پڑھی جاسکتی ہے آج بھی گزشتہ قوموں کی عظمت وجلال کی سب سے بڑی نشانیاں ان کی عمارتوں کے کھنڈر ہیں۔

اسلامی اندلس کی تاریخ میں مسلمانوں کے عروج کے سب سے بڑے شاہد الزہرا کے کھنڈر اور الحمراء کے در و دیوار ہیں، ہندوستان میں تیموریوں کی عظمت کی شہادت تاج محل، لال قلعہ، جامعہ مسجد اور فتح پور سیکری کی عمارتوں سے ملتی ہے اسی طرح عباسی تمدن کی شوکت وعظمت کا سب سے بڑا نشان اور اس کا مرکز بغداد تھا اور عباسیوں کے تمدن سے واقفیت کے لیے اس عظمت وشان سے واقفیت ضروری ہے، لیکن عباسیوں کے دور زوال ہی میں اس پر ایسے مسلسل وپیہم انقلابات طاری ہوئے کہ وہ اسی زمانہ میں گویا ویران ہو چکا تھا اور جو کچھ بچی کھچی یادگاریں رہ گئی تھیں وہ تاتاریوں کے سیلاب کی نذر ہو گئیں اور بغداد کی عظمت گزشتہ پر آنسو بہانے والے کھنڈر بھی باقی نہ رہ گئے اور اب بغداد میں اس کے پرانے شکستہ مقابر کے علاوہ اس کا کوئی مرثیہ خواں باقی نہیں ہے صرف کتابوں کے اوراق سے اس کی عظمت وشوکت کا پتہ چلتا ہے۔'' (۱۲)

شاہ صاحب کا خیال تھا کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان نفرت وعداوت پیدا کرنے اور ان کے اتحاد ویگانگت کے جذبات کو پارہ پارہ کرنے کے لیے انگریزوں نے تاریخ کو استعمال کیا اور اپنی تاریخوں میں ایسے واقعات لکھے جن سے منافرت کے جذبات مشتعل ہوں، وہ لکھتے ہیں:

''بیرونی اجنبی قوموں نے خاص سیاسی اغراض کے ماتحت

ہندوستان کے اسلامی عہد کی نہایت غلط اور مسخ تاریخیں لکھیں جن کا مقصد یہاں کے مختلف فرقوں میں باہم بغض و منافرت پھیلانا، ان کے دلوں سے ان کے شاندار ماضی اور ان کے اسلاف کے کارناموں کی وقعت گھٹانا، ان کی پستی اور نئی حکمراں قوم کی عظمت و برتری کا نقش جمانا تھا۔'' (۱۳)

چنانچہ آزادی کے بعد جب تاریخ ہند کی ازسرنو تدوین کی ضرورت کا اہل علم و دانش کو احساس ہوا اور متعدد اہل قلم اور اداروں نے اس کی طرف توجہ کی تو شاہ صاحب نے متنبہ کیا کہ:

''تاریخ کے لکھنے کا موقع بار بار نہیں آتا اس لیے ان اداروں کو ابتدا ہی سے مذکورہ بالا اہم اور ضروری پہلوؤں کو پیش نظر رکھنا چاہیے ورنہ اگر ان تاریخوں میں فروگذاشتیں رہ گئیں تو پھر اس کی تلافی مدتوں نہ ہو سکے گی اور چونکہ یہ اپنی قومی تاریخیں ہوں گی اس لیے ان کی غلطیاں دوسری اقوام کی لکھی ہوئی تاریخوں کی غلطیوں سے زیادہ مضرت رساں ثابت ہوں گی۔'' (۱۴)

تاریخ نویسی کے سلسلے میں شاہ صاحب کا یہ بھی نقطۂ نظر تھا کہ اس میں اعلیٰ قومی مقاصد اور اس کے مفاد کو بھی پیش نظر رکھنا چاہیے، اسے وہ تاریخ نویسی کی دیانت کے خلاف تصور نہیں کرتے تھے، وہ لکھتے ہیں:

''کسی تاریخ خصوصاً اپنی قوم کی تاریخ کی تدوین میں اعلیٰ قومی مقاصد کا لحاظ رکھنا تاریخ نگاری کی دیانت کے خلاف نہیں ہے تاریخی دیانت اور خیانت کا مقصد یہ ہے کہ ذاتی جذبات، فرقہ وارانہ اغراض اور پست مقاصد کے لیے تاریخ کو مسخ یا اس پر ملمع نہ کیا جائے، یہ نہیں ہے کہ غایت دیانت داری اور غیر جانب داری میں قومی تعمیر کو نظر انداز کر دیا جائے اور نہ اس دیانت کا ثبوت آج تک کسی قوم کے مورخ نے دیا ہے، موجودہ زمانہ کی تاریخوں کو نہ صرف قوموں کو نیک نام اور بدنام کرنے بلکہ ان کو بنانے اور بگاڑنے میں بھی دخل ہے، اس لیے ان کی تدوین میں کسی حال میں بھی قومی

مقاصد سے قطع نظر نہیں کیا جاسکتا، خصوصاً ہندوستان کی تاریخ میں، جس کا
ابھی تعمیری دور ہے۔" (۱۵)

اس جائزے سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی اردو کے
کس قدر ممتاز اور بلند پایہ مورخ تھے۔



حواشی

(۱) تاریخ اسلام جلد اول مقدمہ ص ۱۴
(۲) ایضاً جلد ۳ ص ۲
(۳) ایضاً جلد اول مقدمہ ص ۱۴
(۴) ایضاً جلد اول ص ۲۲۴۔۲۲۵
(۵) ایضاً جلد دوم ص ۳۴۲۔۳۴۳
(۶) ایضاً جلد چہارم ص ۴۲۲
(۷) ایضاً جلد دوم ص ۳۹
(۸) ماہنامہ معارف مارچ ۱۹۸۲ء ص ۱۶۶۔۱۶۷
(۹) ایضاً فروری ۱۹۴۴ء ص ۸۳
(۱۰) تاریخ اسلام جلد دوم ص ۱۸۱
(۱۱) ایضاً جلد دوم ص ۳۳
(۱۲) تاریخ اسلام جلد چہارم ص ۴۲۵۔۴۲۶
(۱۳) ماہنامہ معارف فروری ۱۹۴۴ء ص ۸۲
(۱۴) ایضاً
(۱۵) ایضاً ص ۸۳۔۸۴



(باب ششم)

اسلوب نگارش

دبستان شبلی کا ایک خاص اسلوب نگارش ہے جس کے بانی علامہ شبلی نعمانی ہیں، مولانا سید سلیمان ندوی اور مولانا عبدالسلام ندوی اور دیگر رفقائے دارالمصنفین نے اسی خاص اسلوب کا تتبع کیا، خاص طور سے مولانا عبدالسلام ندوی کو علامہ شبلی کے طرز نگارش کا کامل متبع کہا گیا، شاہ معین الدین احمد ندوی کی نثر اسی دبستان تحریر کا نمونہ ہے، مولانا ضیاء الدین اصلاحی رقم طراز ہیں:

> ''ان کی تحریروں میں وہی لطف و حلاوت، وہی دل کشی و جاذبیت، وہی سلاست و روانی، وہی شگفتگی و بے ساختگی، وہی رعنائی و بانکپن، وہی اعتدال و توازن اور وہی اختصار و جامعیت ہے جو شبلی اسکول کا طغرائے امتیاز ہے۔'' (۱)

شاہ صاحب کی تحریروں میں تصنع اور تکلف نہیں، عبارت کو پرکیف اور رنگین بنانے کی وہ عمداً کوشش نہیں کرتے بلکہ بے ساختہ و برجستہ لکھتے جاتے ہیں، جچے تلے الفاظ کا استعمال ان کی خاص خوبی ہے، ایک لفظ بھی بے جا نظر نہیں آتا، ڈاکٹر محمد نعیم صدیقی ندوی نے سچ لکھا ہے کہ:

> ''شاہ صاحب کی نثر میں بڑی شگفتگی روانی اور نہایت بانکپن ہوتا تھا جامعیت اور ایجاز اس کے نمایاں ترین جوہر تھے، حشو و زوائد کا وہاں گزر نہیں، گویا متن ہی متن تھا، شرح و تعلیق سے کوئی واسطہ نہ تھا۔'' (۲)

اس کا بھی اعتراف کیا گیا کہ شاہ صاحب کو مبالغہ آرائی، جذباتیت اور اطناب سے بڑی نفرت تھی، وہ کم سے کم لفظوں کے استعمال پر زور دیتے تھے اور اپنے رفقا کو برابر ہدایت دیتے رہتے تھے کہ الفاظ کم سے کم اور معنویت سے پر استعمال کئے جائیں تا کہ نثر کی دل کشی و رعنائی باقی رہے اور غالباً اسی لئے مولانا عبدالسلام ندوی شاہ صاحب کی ادبی خوش مذاقی پر بڑا بھروسہ کرتے تھے۔ (۳) مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ نے شاہ صاحب کے اسلوب نگارش میں سلاست وحلاوت کو ان کے قلم کا جوہر قرار دیا ہے۔ (۴)

غرض یہ کہ شاہ صاحب کے اسلوب میں وہ تمام خوبیاں پائی جاتی ہیں جو اعلیٰ نثر نگاری کے لئے ضروری ہیں۔

شاہ صاحب کی متعدد تحریریں اوپر گزر چکی ہیں مثال کے طور پر یہاں ایک دو اقتباسات اور پیش کئے جاتے ہیں تا کہ ان سے ان کا اسلوب اور طرز نگارش اور واضح ہو جائے، تابعین عظام کے گوناں گوں کارناموں پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''یہ مقدس جماعت علم وعمل میں صحابہ رسول ﷺ کا عکس اور پرتو تھی، اس لیے رسول اللہ ﷺ کی تعلیمات اور صحابہؓ کی علمی واخلاقی وراثت کو مسلمانوں میں پھیلایا، عہد رسالت کے بعد اور شخصی حکومت کے اثر سے اسلامی نظام میں جو خرابیاں پیدا ہو گئی تھیں ان کی اصلاح کی اور اگر اصلاح نہ کر سکی تو ان خرابیوں کے مقابلہ میں اسلام کے مصفا سرچشمہ کو باہر کے گرد وغبار اور کدورت سے اپنی کوششوں سے محفوظ رکھا، مذہبی علوم کی حفاظت واشاعت کے لیے نئے علوم کی بنیاد رکھی اسلامی سلطنت کے حدود کو وسیع کیا، اسلام کو پھیلایا غرض ان تمام برکتوں کو جن کا عہد صحابہ میں آغاز ہوا تھا، تکمیل تک پہنچایا۔'' (۵)

ادبی موضوعات پر تحریروں میں خود بہ خود دلآویزی پیدا ہو جاتی ہے مگر یہ حد سے متجاوز ہونے کے بعد افادیت کھو دیتی ہے، شاہ صاحب ادبی موضوعات پر لکھتے ہیں تو ان کے قلم میں

بڑی جاذبیت اور دل کشی پیدا ہو جاتی ہے، تاہم وہ افادیت کو بھی برقرار رکھتے ہیں اور لفظوں کے برمحل استعمال سے اس میں اور رعنائی پیدا کر دیتے ہیں، شعلہ طور پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''گوان کا گلستانِ شاعری آغاز ہی سے اپنے پر بہار مستقبل کا پتہ دیتا تھا، تاہم آج سے دس برس پہلے اور اب کے کلام میں زمین و آسمان کا فرق نظر آتا ہے، پہلے ایک کلی تھی اب گل خنداں ہے، پہلے ایک جوئے مستانہ خرام تھا اب پر شور طوفان ہے، پہلے بے خودی میں احساس بھی شامل تھا اب ہمہ تن بے خودی اور بے خبری ہے، غرض یہ شراب پرانی ہو کر خالص جو ہر بن گئی ہے جس کا ایک ایک قطرہ دوسرے لذت آشناؤں کو بھی سرشار بنا دیتا ہے۔''(۶)

سلاست و روانی اور شستگی و بے ساختگی شاہ صاحب کی نثر کی بڑی خوبیاں ہیں اس کا ایک نمونہ ملاحظہ ہو، وہ لکھتے ہیں:

> ''سرود زندگی میں پختگی ہے، گہرائی ہے، فکر و تدبر ہے، بیان حقیقت ہے، اخلاق ہے، فلسفہ ہے، تصوف ہے، غرض اس سرود کے تمام نغمے لاہوتی ہیں، اگر چہ کہیں کہیں مجاز کا رنگین حجاب بھی نظر آتا ہے، لیکن وہ اتنا لطیف اور ہلکا ہے کہ اندر سے حسن حقیقت صاف جھلکتا دکھائی دیتا ہے، لیکن ان تمام محاسن کے باوجود بڑا حصہ جذبات کی بے ساختگی سے خالی ہے اور خیال آفرینی کا غلبہ ہے۔''(۷)

مختصر یہ کہ شاہ معین الدین صاحب کی شخصیت میں بڑی جامعیت تھی، وہ تذکرہ نگار، مؤرخ، ادیب، نقاد، سخن فہم و سخن سنج اور صاحب اسلوب تھے، ان کی شخصیت میں جو پہلو سب سے زیادہ دلکش ہے وہ ان کا اسلوب نگارش ہے جس کا متعدد اہل نظر نے اعتراف کیا ہے۔

☆☆☆

حواشی

(۱) تعمیر حیات لکھنؤ (شاہ معین الدین احمد ندوی نمبر) ص ۱۵، مارچ اپریل ۱۹۷۵ء

(۲) ایضاً ص۱۵

(۳) ایضاً ص۱۱ و ۱۵

(۴) پرانے چراغ حصہ اول ص ۴۵۸

(۵) تابعین ص ۵

(۶) ادبی نقوش ص ۱۷۱

(۷) ایضاً ص۲۵۲۔۲۵۳



(باب ھفتم)

افکار و خیالات

مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی ایک بڑے مفکر بھی تھے ان کے علمی کارنامے اس بات کے شاہد ہیں کہ وہ قومی، ملی اور ملکی مسائل و معاملات میں ایک فکر رکھتے تھے ان کے غور و فکر کا ایک زاویہ اور ایک نقطۂ نظر تھا خاص طور سے ان کی تصنیفات کو بہ نظر غائر دیکھا جائے تو ان کی مفکرانہ حیثیت زیادہ واضح ہو کر سامنے آتی ہے، مثلاً ان کی تصنیف اسلام اور عربی تمدن سے واضح ہوتا ہے کہ وہ تمدن اسلام کی ترقی کے خواہاں تھے اور اسی کو اصل تمدن خیال کرتے تھے۔ اسی طرح تاریخ اسلام کے مختلف حصے اس بات کے شاہد ہیں کہ تاریخ کو تاریخ کی نظر سے دیکھا جائے اور اس سے سبق لیا جائے، سیر الصحابہ کے مختلف حصے علم و عمل کا ایک عالمگیر تصور پیش کرتے ہیں، انسانیت، امن عالم، مساوات اور معاشرتی ترقی کے نقطۂ نظر سے ان کی تصنیف ''دین رحمت'' ایک بڑا کارنامہ ہے غرض یہ کہ ان کی تصنیفات سے ان کے فکر و خیال کا بہ خوبی اظہار ہوتا ہے۔

لیکن ان کے فکر و خیال کے نمونے ان کی تصنیفات سے زیادہ روشن ان کے شذرات میں ہیں جس کے ذریعہ وہ برابر مسلمانوں کے قومی، ملی اور عالمی مسائل میں رہنمائی کا فریضہ انجام دیتے رہے اور جس سے ان کے قومی درد و سوز کا بھی پتہ چلتا ہے، ان کے شذرات کی خصوصیات، شہرت و مقبولیت اور اہمیت کو واضح کرتے ہوئے حافظ عمیر الصدیق ندوی دریابادی لکھتے ہیں:

"شاہ صاحب کے شذرات ایک انسائیکلوپیڈیا کی حیثیت رکھتے ہیں، قومی و ملی مسائل کا سامنا پھر قوم بھی کون؟ ہندوستانی، ملت بھی کیسی؟ اسلامی!! خون ٹپک ٹپک کر رہا، درد میں اضافہ ہی ہوتا گیا، مرثیے جدید نوحے ہو گئے، ان کے شذرات، پھر قوم کو دلاسہ، امت کو پرسہ، تشجیع و تحریض، جوش و ولولہ کے لیے ان کی بھرپور کوششیں، فکری سلامتی اور ذہنی رشد کے آئینہ دار بن گئے، ان کے شذرات غیروں کی نیش زنی اور ایذا رسانی پر کس طرح مسکرا مسکرا کر درد کی شدت کو چھپا چھپا کر اپنا پیغام محبت پہنچاتے رہے۔"(۱)

شاہ صاحب کے شذرات کی یہی خوبیاں تھیں جن کی وجہ سے وہ ہر طبقے اور ہر حلقے میں قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھے اور ادب و احترام سے پڑھے جاتے تھے، ان کے شذرات ہندوستان کے اس پرآشوب دور کی تاریخ بھی ہیں، جس میں جدوجہد آزادی اپنے نقطۂ عروج پر تھی، ملک کو آزادی ملی، بعض ناعاقبت اندیشوں کی وجہ سے ملک کے حصے بکھر ہوئے، مسلمانوں کے ساتھ زیادتیاں اور ناانصافیاں ہوئیں، ان کی زبان ختم کی گئی، ان کی تہذیب پر حملے ہوئے، فرقہ وارانہ فسادات کا ایک طویل سلسلہ چل پڑا، ان سب کی تفصیلات شاہ صاحب نے قلم بند کی ہے اور واقعہ یہ ہے کہ ملک و ملت کا شاید ہی کوئی ایسا پہلو ہو جس کا ذکر انہوں نے نہ کیا ہو، یہاں اس کے چند نمونے پیش کیے جاتے ہیں تاکہ ان کے افکار و خیالات کا اندازہ ہو سکے۔

اردو

شاہ صاحب کی تعلیم و تربیت لکھنؤ میں ہوئی جہاں کوثر و تسنیم سے دھلی ہوئی زبان بولی جاتی تھی، خود شاہ صاحب کی زبان بھی بڑی شستہ و شگفتہ اور دلآویز تھی، جس سے انہیں عشق تھا، چنانچہ انہوں نے اردو ہی کو تصنیف و تالیف کا ذریعہ بنایا، یہی وجہ ہے کہ وہ آخر تک اردو کی بقا و ترقی کے لیے کوشاں رہے۔

شاہ صاحب نے اردو کا دور عروج دیکھا اور دور زوال بھی، انہیں کے عہد میں اردو

ہندی تنازعے نے طول پکڑا اور پھر ایک وقت ایسا آیا کہ اردو کو دیس نکالا دے دیا گیا، غرض یہ کہ اردو کے ساتھ جو ناانصافیاں اور زیادتیاں اپنوں اور غیروں نے کیں، وہ سب شاہ صاحب کے سامنے ہوئیں اس لیے وہ اس کی زندہ تاریخ تھے اور یہ تاریخ انہوں نے معارف کے شذرات میں ہمیشہ کے لیے محفوظ کر دی ہے۔

آزادی کے بعد اردو کے ساتھ سخت ناانصافی ہوئی اسے ختم کر کے اس کی جگہ راتوں رات ہندی کو سرکاری زبان بنا دیا گیا، شاہ صاحب نے اس زیادتی کے خلاف سخت احتجاج کیا اور اردو کے مقابلے میں ہندی کو جن بنیادوں پر ترجیح دی گئی تھی اور اس کے لیے جو دلائل پیش کئے گئے، شاہ صاحب نے اسے ناقابل قبول قرار دیا اور لکھا کہ:

''قومی اور جمہوری حکومت نے اردو زبان کے ساتھ چند مہینوں میں جو سلوک کیا وہ غیر ملکی اور مستبد حکومت چند صدیوں میں بھی نہ کر سکی تھی اور اس کے جواز کے لیے جو دلیل پیش کی جاتی ہے اس کو نہ منطق سے واسطہ ہے نہ سچائی سے، اسے کون منصف مزاج یقین کر سکتا ہے کہ صوبہ متحدہ کی اکثریت کی زبان ہندی اور اردو صرف ۱۴ فی صد کی زبان ہے، یہاں تک تو تسلیم کیا جا سکتا ہے کہ علمی و ادبی اردو عام بول چال کی زبان اور شہری اور دیہاتی زبان میں فرق ہے لیکن صرف عربی و فارسی الفاظ کی آمیزش تلفظ کی صحت و شائستگی اور لب و لہجے کا کوئی ایسا بنیادی فرق نہیں ہے جس کی بنا پر ان زبانوں کو بھی مختلف زبانیں کہا جائے چہ جائے کہ ہندو مسلم زبانیں قرار دیا جائے، زبان کی یہ تقسیم بالکل نئی ہے، شہر کے باشندوں کی زبان خواہ ہندو ہوں یا مسلمان اسی طرح سے دیہات کے تمام باشندوں کی زبان بالکل ایک ہے، عام بول چال کی زبان ہندو و مسلمان یکساں بولتے اور سمجھتے ہیں اور اس کے مقابلہ میں جو زبان گڑھی جا رہی ہے اسے نہ صرف مسلمان بلکہ وہ ہندو بھی نہیں سمجھتے جو سنسکرت سے ناواقف ہیں۔'' (۲)

آزادی کی تحریک میں اردو سے بھرپور کام لیا گیا، سرفروشی کی تمنا اب ہمارے دل میں ہے، انقلاب زندہ باد وغیرہ نعرے ہر مجاہد آزادی کی زبان پر رہے مگر آزادی کے فوراً بعد اردو کی جگہ ہندی کو دے دی گئی اس سلسلے میں شاہ صاحب کا موقف بہت واضح تھا، ان کا خیال تھا کہ ہندی ہندو کلچر کی نمائندہ ہے جب کہ اردو سیکولرزم کی نشانی ہے اس میں ہندو مسلم دونوں کے تہذیبی وثقافتی عناصر پائے جاتے ہیں اس لیے یہی ملک کی عام زبان ہونی چاہیے۔ (۳) انہوں نے اپنے ایک طویل مضمون ''اردو شاعری میں ہندو کلچر'' کی نشاندہی کی ہے جو ان کے ادبی مضامین کے مجموعے ''ادبی نقوش'' میں شامل ہے۔

دوسرے دانش وروں کی طرح شاہ صاحب بھی اردو کو ہندوؤں اور مسلمانوں کی مشترک زبان قرار دیتے تھے، ان کا خیال تھا کہ اردو کو بنانے سنوارنے اور پروان چڑھانے میں ان دونوں قوموں نے دل ودماغ صرف کیے۔

مخالفین اردو اور ہندی کے ہم نواؤں کا خیال تھا کہ اردو کے ہوتے ہوئے ہندی کا چراغ نہیں جل سکتا، شاہ صاحب نے اس کی بھی تردید کی اور لکھا کہ اردو کے رہتے ہوئے اگر انگریزی اور دوسری علاقائی زبانیں ترقی کر سکتی ہیں تو ہندی کیوں ترقی نہیں کر سکتی، یہ ایک محض مفروضہ ہے اس کی تردید کے ساتھ انہوں نے اردو کی قومی، لسانی، تہذیبی اور تمدنی حیثیت بھی واضح کی اور حکومت کو متنبہ کیا کہ اگر وہ اردو کا جائز حق نہیں دیتی تو اس سے متحدہ قومیت کو نقصان پہونچے گا، چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

> ''اردو کا مسئلہ درحقیقت سیاسی سے زیادہ قومی، لسانی اور تہذیبی اہمیت رکھتا ہے اور ہندو مسلم اتحاد، ہندوستان کے مشترک کلچر اور متحدہ قومیت کی سب سے بڑی نشانی ہے اور اس وصف میں ہندوستان کی کوئی زبان اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی، اور سب زبانیں مقامی اور صوبائی ہیں اور خاص خاص کلچروں کی نمائندگی کرتی ہیں، اور اردو پورے ہندوستان کی ثانوی اور مشترک زبان ہے، اس میں اس کے تمام فرقوں اور طبقوں کے کلچر کی روح

جھلکتی ہے۔ دلی، اتر پردیش اور بہار وغیرہ کے علاوہ جن کی اردو مادری زبان
ہے ان صوبوں میں بھی جن کی وہ مادری زبان نہیں ہے کسی نہ کسی شکل میں
رائج ہے اور ان کے دیہاتوں تک میں سمجھی جاتی ہے اور بڑے شہروں اور
خاص خاص علاقوں میں بولی بھی جاتی ہے اور مختلف صوبوں کے باشندوں
کے درمیان افہام وتفہیم کا ذریعہ ہی یہی اردو ہے، اس کے علاوہ وہ ایک ترقی
یافتہ اور مہذب زبان ہے، اپنا وقیع لٹریچر اور سنجیدہ علمی وادبی ذخیرہ رکھتی ہے
اور ایک بلند اور شائستہ کلچر کی مالک ہے اس لیے ایک ایسی ترقی یافتہ زبان کو
مٹانا جو اتنی گوناگوں خصوصیات کی حامل ہو نہ صرف تعصب وتنگ نظری ہے
بلکہ علم وتمدن اور قوم وملک کے ساتھ دشمنی ہے، اس سے متحدہ قومیت کو نقصان
پہونچے گا حکومت کا اعتبار اٹھ جائے گا اور اس کے سیکولرزم کے دعوے کی
تردید ہوگی۔'' (۴)

اردو کو ختم کرنے کی سرکاری سطح پر جو کوششیں ہو رہی ہیں اس کی ابتدا شاہ صاحب کے عہد میں ہوئی اور جیسے آج رہ رہ کر اردو کے رسم الخط کے بدلنے کی باتیں بار بار اٹھائی جاتی ہیں اسی طرح شاہ صاحب کے زمانہ میں بھی یہ شاطرانہ چلیں چلی جاتی تھیں اور جیسے آج رسم الخط تبدیل کرنے کے لیے اردو دشمنوں کو کچھ ہم نوا مل جاتے ہیں، اسی طرح اس وقت بھی بعض ہم نوا مل گئے تھے، مگر شاہ صاحب اس کے سخت مخالف تھے، ان کا عقیدہ تھا کہ رسم الخط بدلنے سے زبان ہی بدل جائے گی، وہ لکھتے ہیں:

''اردو کو ختم کرنے کی جو تدبیریں کی جارہی ہیں ان میں سب
سے زیادہ خطرناک اس کا رسم الخط بدلنے کی تجویز ہے، جو بظاہر اس کی
ہمدردی میں کی جارہی ہے کہ اگر اس کا رسم الخط دیوناگری کردیا جائے تو ہندی
والوں کی مخالفت ختم ہوجائے گی اور وہ اردو کو قبول کرلیں گے اردو کے مخالفین
کی طرف سے تو یہ تجویز سمجھ میں آتی ہے کہ اس سے کسی جھگڑے کے بغیر خود

اردو والوں کے ہاتھوں ان کا مقصد حاصل ہو جاتا ہے لیکن اردو کے نادان دوستوں کی طرف سے اس کی تائید عبرت انگیز ہے، یہ صحیح ہے کہ رسم الخط بدل جانے سے زبان ختم نہیں ہو جاتی لیکن اردو کی پوزیشن ایسی ہے کہ وہ ہندوستان میں صرف اپنے رسم الخط کی وجہ سے زندہ ہے، اردو ہندی میں کوئی بنیادی فرق نہیں ہے، دونوں کے قواعد ایک ہیں، مصادر ایک ہیں، ضمیریں ایک ہیں، بہت سے اسماء مشترک ہیں، اگر اردو میں ہندی اور سنسکرت کے الفاظ بڑھا دیئے جائیں تو وہ ہندی بن جائے گی، ہندی میں عربی و فارسی کے الفاظ بڑھا دیئے جائیں تو وہ اردو ہو جائے گی، دونوں میں مابہ الامتیاز صرف رسم الخط ہے اگر اردو کا رسم الخط دیوناگری کر دیا جائے تو وہ چند دنوں میں ہندی کا قالب اختیار کر لے گی، اور ہندی والوں کے رد و قبول کا سوال ہی باقی نہ رہ جائے گا۔'' (۵)

شاہ صاحب رسم الخط کی تبدیلی کو اس لیے بھی مضر خیال کرتے تھے کہ اس سے زبانیں برباد ہو جاتی ہیں، اس کی متعدد مثالیں بھی انہوں نے پیش کی ہیں، خاص طور سے مصطفیٰ کمال کا ذکر کیا ہے کہ اس نے ترکی رسم الخط کو بدل دیا تو پوری ترک قوم اپنے قومی ذخیرے سے بالکل بے بہرہ ہو گئی۔ (۶) اردو کے ساتھ حکومت اور ہندی والوں کے رویے کے ذکر کے سلسلے میں انہیں اردو طبقے کے ان سیاسی نمائندوں کی بے حسی پر بھی رونا آیا جو حکومت کے اداروں یعنی پارلیامنٹ اور اسمبلی میں موجود رہ کر بھی اپنے طبقے کے حقوق کے لیے مہر بلب رہتے تھے، ایک اقتباس ملاحظہ ہو جس سے پتہ چلتا ہے کہ اردو طبقے کی اس بے حسی اور بے اعتنائی کے متعلق شاہ صاحب کا انداز نظر کیا تھا، اور اردو والوں کے اس رویہ کے بارے میں وہ کس درجہ حساس تھے:

''اردو کے بارے میں حکومت کی پالیسی کھلی ہوئی ہے اس سے توقع رکھنا عبث ہے، افسوس کی بات یہ ہے کہ خود اردو کے بہت سے ہوا خواہ

اس کی بقا و تحفظ کے لیے جو کچھ کر سکتے ہیں وہ بھی نہیں کرتے، اس میں سب سے زیادہ شکایت پارلیامنٹ اور اسمبلیوں کے مسلمان ممبروں سے ہے وہ نجی صحبتوں میں اردو کشی کا رونا روتے ہیں لیکن ان کی پارلیامنٹ اور اسمبلیوں میں لب کشائی کی جرأت نہیں ہوتی، ہندو ممبر تو کبھی کبھی اردو کی حمایت میں آواز بلند کر دیتے ہیں، مسلمان ممبروں سے اتنا بھی نہیں ہوتا، اگر وہ متحدہ آواز بلند کریں تو اردو کے بہت سے حقوق مل جائیں۔" (۷)

اردو کے ساتھ اہل سیاست اور عام اردو داں طبقے کے طرز عمل کا ذکر بھی شاہ صاحب نے بڑے افسوس کے ساتھ کیا ہے جس سے ہمارا یہ خیال کہ اردو کو اردو والوں نے مخالفین اردو سے زیادہ نقصان پہونچایا کی تصدیق ہوتی ہے، وہ لکھتے ہیں:

"آج اردو کے حامیوں سے کچھ کہنا ہے ان کو اردو کے ساتھ حکومت کے طرز عمل کی شکایت بالکل بجا ہے لیکن اگر ان سے سوال کیا جائے کہ خود ان کا طرز عمل اردو کے ساتھ کیا رہا ہے اور انہوں نے اس کی کیا خدمت کی ہے تو ان کے پاس اس کا کوئی معقول جواب نہیں ہے، ہمارے ایک طبقہ کی اردو سے بے تعلقی کا یہ حال ہے کہ وہ اپنے بچوں کی اردو تعلیم کی جانب بھی توجہ نہیں کرتا، اونچے تعلیم یافتہ گھرانوں میں تو بسم اللہ انگریزی سے کرائی جاتی ہے، تقریر و تحریر، خط و کتابت اور گھر سے باہر اکثر و بیشتر گفتگو بھی انگریزی یا ایسی زبان میں ہوتی ہے جس میں پچاس فیصد سے زیادہ الفاظ انگریزی کے ہوتے ہیں اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اردو محض مادری زبان کی حیثیت سے تو بولنا آجاتی ہے لیکن بہت سے تعلیم یافتہ اشخاص صاف اور سلیس اردو نہیں لکھ سکتے ان کو خط لکھنے میں دشواری ہوتی ہے اور املا تک میں غلطیاں کرتے ہیں اس کا مشاہدہ مغرب زدہ گھرانوں میں کیا جا سکتا ہے اور یہ پرانی داستان نہیں بلکہ آج بھی یہی ہو رہا ہے۔" (۸)

اپنوں اور غیروں کی اس بے اعتنائی کے باوجود شاہ صاحب برابر نہایت جوش اور سوز سے اردو کے لیے سرگرم رہے، حکومت بالخصوص اتر پردیش کی حکومت سے سیکولرزم اور جمہوریت کی دہائی دے کر اردو کے حقوق کے وہ مسلسل طلب گار رہے اور ایک وقت ایسا بھی آیا کہ حکومت نے اردو کے سلسلے میں بعض رعایتیں دینی چاہی تو شاہ صاحب نے ان رعایتوں کے بجائے اردو کے قانونی اور دستوری حقوق کی مانگ کی اور بڑے پتے کی بات لکھی کہ:

> ''اگر چہ اردو بھی لسانی اقلیتوں میں ہے اور ان کے مطالبات میں برابر کی شریک ہے مگر اس کی حیثیت دوسری لسانی اقلیتوں سے تھوڑی مختلف ہے، دوسری ریاستوں کو اپنی اقلیتوں سے وہ عناد نہیں جو اتر پردیش کی حکومت اور پورے عملے کو اردو کے ساتھ ہے اس کی اردو دشمنی سب کو معلوم ہے ایسی حالت میں جب تک تمام حقوق کا دستوری تحفظ نہ ہو جائے اس وقت تک محض سفارش یا کسی افسر کے تقرر سے اردو کو فائدہ نہیں پہونچ سکتا، اور اس خطرہ سے دوسری زبانیں بھی محفوظ نہیں رہ سکتیں بلکہ دستوری تحفظ کے بعد اس کے عملی نفاذ کے لیے کوشش اور نگرانی کی ضرورت ہوگی۔'' (۹)

افسوس ملک کے دوسرے دانشوروں اور اردو کے ہمدردوں کی طرح شاہ صاحب کی بھی یہ تمام کوششیں رائیگاں گئیں اور اردو کو اپنا جائز حق آج تک نہ مل سکا، حکومتیں بنتی بگڑتی رہیں مگر اردو محض وعدوں سے ہم کنار ہوئی۔

فارسی

شاہ صاحب اردو کے ساتھ فارسی زبان کی ترقی اور بقا بھی چاہتے تھے، ان کا خیال تھا کہ اردو کے لیے فارسی ضروری ہے کہ اس میں بیشتر الفاظ فارسی ہی کے ہیں، چونکہ فارسی ہندستان میں ایک مدت تک حکومت کی زبان رہی اس لیے فارسی زبان وادب کے ذوق کو ختم ہوتے ہوئے دیکھ کر انہیں دکھ ہوا، چنانچہ جب انڈو ایران سوسائٹی کا قیام عمل میں آیا اور اس نے چند برس میں اچھے سمینار اور علمی مذاکروں کا انعقاد کیا تو شاہ صاحب نے انہیں مشورہ دیا کہ:

''فارسی صدیوں تک ہندوستان کی علمی و سرکاری زبان رہ چکی ہے، آج بھی اس کا جلوہ اردو میں نظر آتا ہے مگر اب اس زبان کا مذاق روز بہ روز ہندوستان سے ختم ہو رہا ہے، ایران سوسائٹی کا فرض ہے کہ اس کو زندہ رکھنے کی کوشش کرے اس کی ایک صورت یہ ہے کہ وہ ایران کی نئی مطبوعات کی فراہمی کا انتظام کرے...... یہ علمی خدمت بھی ہوگی اور اس کے ذریعہ فارسی زبان کے ساتھ کچھ نہ کچھ لگاؤ باقی رہے گا۔'' (۱۰)

خریطۂ جواہر پر نقد و تبصرہ بھی فارسی شعر و ادب سے ان کی گہری دلچسپی کا نتیجہ ہے۔

مسلم یونیورسٹی

شاہ صاحب کا خیال تھا کہ مسلم یونیورسٹی ہندوستان کے مسلمانوں کا ایک صدی کا قیمتی سرمایہ، عزیز متاع اور ان کے دل و دماغ کا سرچشمہ اور مسلمانوں کی تہذیب و ثقافت کا مرکز ہے اس لیے بہر صورت اس کی شناخت کو باقی رہنا چاہیے، خاص طور سے حکومت کو اس کے معاملات میں کسی قسم کی مداخلت نہیں کرنی چاہیے۔

شاہ صاحب کو قوم و ملت کے ہر بہی خواہ کی طرح مسلم یونیورسٹی کے مسائل و معاملات سے ہمیشہ دلچسپی رہی وہ اس کی کورٹ کے ممبر بھی رہے اس پر جب بھی کوئی افتاد پڑی یا کوئی الزام عائد کیا گیا یا حکومت کی طرف سے مداخلت کی گئی تو شاہ صاحب کا قلم نیام سے باہر آجاتا اور وہ سینہ سپر ہو جاتے، چنانچہ جب اس کے اقلیتی کردار کو مجروح کیا گیا تو شاہ صاحب نے بھی اس کے خلاف آواز بلند کی، پارلیامنٹ کے یونیورسٹی دشمنوں کی سخت مذمت کی اور اسے فرقہ پرستی اور مسلم دشمنی سے تعبیر کیا، اسی طرح جب اس پر فرقہ پرستی کا الزام عائد کیا گیا تو انہوں نے لکھا کہ:

''جو لوگ مسلم یونیورسٹی پر فرقہ پرستی کا الزام لگاتے ہیں وہ ذرا اپنے گریبان میں منھ ڈال کر دیکھیں کہ ہندو یونیورسٹی میں مسلمان طلبہ کی تعداد کتنی ہے بلکہ ہندوؤں میں بھی ہریجن طلبہ کے ساتھ کیا سلوک کیا جاتا ہے

ہندو یونیورسٹی تو خیر ہندوؤں کی ہے اگر ان یونیورسٹی کے اساتذہ اور طلبہ کے اعداد و شمار فراہم کئے جائیں جو مشترک کہلاتی ہیں تو ان کے سیکولرزم اور فرقہ واریت کا سارا بھرم کھل جائے گا، اگر چہ زیدی صاحب نے اس الزام کی پوری تردید کی ہے کہ انجینئرنگ کالج کے طلبہ کی بڑی تعداد پاکستان چلی جاتی ہے لیکن اگر اس کو صحیح مان بھی لیا جائے تو اس میں طلبہ کا کیا قصور؟ جب ہندوستان کے مسلمانوں پر ملازمت کے دروازے تقریباً بند ہیں تو ان کو جہاں بھی ملازمت ملنے کی امید ہوگی چلے جائیں اس میں حکومت کا قصور ہے یا مسلمان طلبہ کا۔'' (۱۱)

شاہ صاحب یونیورسٹی کے اساتذہ، طلبہ اور اس کے اہل قلم پر بھی نظر رکھتے تھے اور انہیں مفید اور قیمتی مشورے دیا کرتے تھے، چنانچہ اہل قلم اور محققین کو مشورہ دیا کہ ان کی علمی تحقیقات محض تاریخی تحقیقات نہ ہوں بلکہ اسلامی تحقیقات ہونی چاہیے، وہ لکھتے ہیں:

''مسلم یونیورسٹی اسلامی تہذیب و ثقافت کی نمائندہ ہے اس لیے اسلامیات کی تحقیق میں اس کا نقطہ نظر تاریخی تحقیق کے ساتھ اسلامی بھی ہونا چاہیے اور اسلامی علوم و فنون اور اسلامی تاریخ و تہذیب کو ان کی صحیح شکل میں اس طرح پیش کرنا چاہیے جس سے ان کی عظمت نمایاں اور دنیا پر اس کے مذہبی، علمی اور تمدنی اثرات ظاہر ہوسکیں، اس بارہ میں ہم کو ہندو فضلا سے سبق لینا چاہیے، جن کا ہر فرد اپنے اپنے دائرہ میں دنیا پر ہندو مذہب ہندو فلسفہ اور ہندو تہذیب کا سکہ بٹھانے میں لگا ہوا ہے، مسلمانوں کے پاس تو علوم و فنون کا پورا خزانہ ہے اور ان کے مذہبی علمی اور تمدنی کارناموں کی ایک شاندار تاریخ موجود ہے اس لیے اگر یونیورسٹی کا یہ ادارہ اسلامی جذبہ سے اس کام کو انجام دے تو مفید خدمت انجام دے سکتا ہے۔'' (۱۲)

ایک عالم دین کی حیثیت سے شاہ صاحب کو شعبۂ دینیات سے خصوصی دلچسپی تھی،

ان کا خیال تھا کہ اس کو بھر پور اہمیت دی جائے ایسے اچھے اساتذہ کا انتخاب کیا جائے جن کی علمی ودینی شہرت مسلم ہو، ان کا یہ بھی خیال تھا کہ اس کے ذریعہ یونیورسٹی میں دین کا وقار قائم ہونا چاہیے، وہ لکھتے ہیں:

> ''مسلم یونیورسٹی مسلمانوں کا محض تعلیمی نہیں بلکہ قومی وملی ادارہ ہے اس لیے اس کا شعبہ دینیات باوقار ہونا چاہیے، اس کا کام محض مقررہ نصاب پڑھادینا نہیں بلکہ یونیورسٹی میں دینی فضا اور دین کا وقار قائم کرنا بھی ہے اور یہ اسی وقت ممکن ہے جب خود یونیورسٹی کے ارباب حل وعقد اس کی جانب توجہ کریں۔'' (۱۳)

اور جب یونیورسٹی پر کمیونسٹوں کا درپردہ غلبہ ہوا تو شاہ صاحب نے یونیورسٹی کے ارباب حل وعقد کو آگاہ کیا کہ ان کا اثر روز بروز بڑھتا جاتا ہے اس کا تدارک ہونا چاہیے۔ (۱۴)

جامعہ ملیہ

علی گڑھ سے ہٹ کر ایک خاص مطمح نظر کی بنیاد پر جامعہ ملیہ کا قیام عمل میں آیا، شاہ صاحب اس کے بھی بڑے بہی خواہ تھے، چنانچہ انہوں نے حکومت کے سامنے تجویز پیش کی کہ جامعہ ملیہ اسلامیہ کو یونیورسٹی بنایا جائے، شاہ صاحب کی یہ تجویز بہت پسند کی گئی، چنانچہ اس کی تائید وحمایت اخبارات ورسائل کے ساتھ انجمن ترقی اردو ہند نے بھی کی اور اسے ایک مثبت تجویز قرار دیا۔ (۱۵)

غالباً شاہ صاحب پہلے شخص ہیں جنھوں نے جامعہ ملیہ کو یونیورسٹی بنانے کی تجویز پیش کی۔

جامعہ عثمانیہ

جامعہ عثمانیہ مادری زبان میں تعلیم کا پہلا کامیاب تجربہ تھا اور بقول شاہ صاحب ''اس کا اعتراف یورپ کی یونیورسٹیوں تک کو کرنا پڑا۔'' بلاشبہ یہ مسلمانوں کا کارنامہ اور ان کی برسوں کی محنت وریاضت کا نتیجہ تھا، مگر کسے معلوم تھا کہ یہ چشم زدن میں خاک میں مل جائے گا، آزادی کے بعد جب ریاست حیدرآباد کو ضم کیا گیا تو سب سے پہلے جامعہ عثمانیہ اردو یونیورسٹی کو ہندی

یونیورسٹی میں تبدیل کردیا گیا، یہ زخم اتنا کاری تھا کہ ہر شخص نے درد محسوس کیا، شاہ صاحب جیسے محب اردو کا قلم خون کا آنسو رویا جس سے معارف کے شذرات سرخ ہو گئے، وہ لکھتے ہیں:

"جامعہ عثمانیہ کے ہندی یونیورسٹی بنائے جانے کی خبر عرصے سے گرم تھی بالآخر یہ حادثہ ہو کر رہا، اس کا انتظام مرکزی حکومت کے ہاتھوں میں آجائے گا اور اس کا ذریعہ تعلیم ہندی زبان ہوگی، ہندوستان کا پورا نظام ہندیایا جارہا ہے اور رفتہ رفتہ تمام یونیورسٹیوں کی تعلیمی زبان ہندی ہوجائے گی، اردو کی یونیورسٹی صرف ایک جامعہ عثمانیہ تھی اگر حکومت اس کو باقی رہنے دیتی تو اس کا کیا بگڑ جاتا اور اس سے ہندی کو کیا نقصان پہونچتا مگر اردو دشمنی کو اتنا بھی گوارا نہ ہوا اور اردو کی اس تنہا یونیورسٹی کو بھی مٹا دیا گیا۔

صبح تک تو نے نہ چھوڑی وہ بھی اے باد صبا
یادگار شمع تھی کل تک جو پروانے کی خاک

پرانے زمانے کے بعض فاتحوں کو آج صرف اس لیے غارت گر اور دشمن علم کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے کہ انھوں نے مفتوح قوموں کے علمی ذخیروں اور تہذیب و تمدن کو مٹایا تھا، کیا جامعہ عثمانیہ کی یہ بربادی اس سے کم ہے بلکہ ان میں سے کچھ ایسے بھی نکل آتے ہیں جو مفتوح قوموں کے علوم سے فائدہ اٹھانے کے لیے ان کو محفوظ رکھتے تھے مگر ہماری حکومت کا کارنامہ ان غارت گروں سے بھی بڑھ گیا اور اس حکومت کے ہاتھوں انجام پایا جو جمہوری اور سیکولر کہلاتی ہے، جامعہ عثمانیہ کو ختم کردینا تو آسان ہے مگر تاریخ اس واقعہ کو فراموش نہ کرے گی اور آئندہ نسلیں اس "علم نوازی" کو عبرت کے ساتھ یاد کرتی رہیں گی۔" (۱۶)

دارالترجمہ حیدرآباد کو ہندوستان کے بیت الحکمت سے تعبیر کیا جاتا ہے، اس کی تباہی و بربادی بھی شاہ صاحب کے عہد کا واقعہ ہے، اس بربادی پر شاہ صاحب کس طرح تڑپے ہیں

اور کس طرح اپنے درد و دکھ کا اظہار کیا ہے، ملاحظہ ہو، وہ لکھتے ہیں:

''بعض اخبارات سے یہ افسوس ناک اطلاع ملی ہے کہ دارالترجمہ حیدرآباد کی کتابیں اصل قیمت سے اسی فیصد سے کم پر فروخت ہو رہی ہیں اگر یہ اطلاع صحیح ہے تو اس کو کس چیز سے تعبیر کیا جائے، وہ بیش قیمت علمی ذخیرے جو لاکھوں روپے کے صرف اور بڑے بڑے اصحاب علم وکمال کی برسوں کی محنت اور جاں کاہی کا نتیجہ تھا، جو اس طرح کوڑیوں کے مول اور ردی کے بھاؤ بک رہا ہے، کیا یہ واقعہ دور وحشت کے فاتحین کے ہاتھوں کتب خانوں کی بربادی کے واقعات سے کم اہم اور درد انگیز ہے اور اگر یہ عذر ہے کہ اب حکومت کی زبان ہندی ہوگئی ہے اس لیے اردو کتابوں کی ضرورت باقی نہیں رہی تو یہی عذر قدیم حکومتوں کے لیے بھی تھا کہ ان کی زبان مفتوح قوموں کی زبان سے مختلف تھی، اس واقعہ کے بعد کون کہہ سکتا ہے کہ کتب خانوں کی تباہی انسان کے دور جہالت کی باتیں تھیں یہ سلوک تو اجنبی اور غیر ملکی حکومت نے بھی ملکی زبانوں کے ساتھ نہیں کیا تھا۔'' (۱۷)

انجمن ترقی اردو ہند

انجمن ترقی اردو کے پہلے سکریٹری علامہ شبلیؒ تھے، اس لیے شاہ صاحب کو بھی اس سے لگاؤ رہا، آزادی کے بعد جب صدر جمہوریہ ڈاکٹر راجیندر پرشاد کے ووٹ سے ہندی کو سرکاری زبان قرار دیا گیا اور اردو کو ملک کی دوسری زبان کا بھی درجہ نہیں دیا گیا بلکہ اس کی حیثیت علاقائی زبانوں سے بھی کم تر ٹھہری تو اس کے حقوق کے لیے جدوجہد کا آغاز ہوا، شاہ صاحب کا خیال تھا کہ اس تحریک کی قیادت انجمن ترقی اردو کو کرنی چاہیے، انہوں نے مشورہ دیا کہ:

''ہماری یہی رائے ہے کہ اردو کی موجودہ تحریک کی قیادت انجمن ترقی اردو کے ہاتھ میں رہنی چاہیے اور دوسرے اداروں کو اس کام میں اس کا ہاتھ بٹانا چاہیے اس لیے کہ اس میں اسی جماعت یا ادارہ کی کامیابی کے

امکانات زیادہ ہیں جو پہلے سے مستقل اور منظم ہو اور پبلک اور گورنمنٹ دونوں میں اس کو اعتماد حاصل ہو، یہ خصوصیات صرف انجمن ترقی اردو میں ہیں۔"(۱۸)

بعض لوگوں نے یہ خدشہ ظاہر کیا کہ انجمن نیم سرکاری ادارہ ہے کہیں وہ حکومت سے راہ و رسم نہ اختیار کر لے، شاہ صاحب نے اس خدشہ کی بھی تردید کی اور لکھا کہ:

"انجمن کے متعلق یہ بدگمانی صحیح نہیں ہے وہ نیم سرکاری ادارہ ہے اس لیے ممکن ہے آئندہ ضرورت کے وقت وہ تیز قدم نہ اٹھا سکے اور کسی نازک مرحلے میں اس کام کو ادھورا چھوڑ کر الگ ہو جائے، اولاً یہ مہم صرف ایک قانونی وکالت ہے جس میں کسی انقلابی قدم کی ضرورت ہی نہ پیش آئے گی لیکن اگر بالفرض ایسا ہو بھی جائے تو انجمن پیچھے قدم نہیں ہٹا سکتی اس لیے کہ اس تحریک کو ہاتھ میں لینے کے بعد اس کا وجود اس سے وابستہ ہو جائے گا، اگر وہ اس کام میں کسی قسم کی کمزوری دکھائے گی تو وہ ختم ہو جائے گی اور اب اردو کا مسئلہ قومی بن گیا ہے اس لیے انجمن کی علیحدگی سے وہ ختم بھی نہیں ہو سکتا اس لیے انجمن سے اس کو نقصان پہونچنے کا کوئی اندیشہ نہیں۔"(۱۹)

شاہ صاحب کے ان خیالات سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ انہیں انجمن ترقی اردو سے کس قدر لگاؤ تھا اور وہ اس پر کس درجہ اعتماد کرتے تھے۔

جمعیۃ علمائے ہند

جمعیۃ علمائے ہند نے ہندوستان کی آزادی میں بڑی قربانیاں دیں اور اس سلسلے میں اس کا بڑا شاندار ماضی ہے لیکن آزادی کے بعد وہ اپنا کردار بخوبی ادا نہ کر سکی اس کے بارے میں شاہ صاحب نے ایک بار لکھا کہ:

"جمعیۃ علمائے ہند کی بنیاد بڑی مقدس ہستیوں کے ہاتھوں پڑی اور اس کے کارناموں کی ایک شاندار تاریخ ہے لیکن اس کا شاندار ماضی حال

کے ہاتھوں تباہ ہو رہا ہے۔" (۲۰)

مسلمانوں کی دل آزاری

شاہ صاحب میں دینی حمیت اور مذہبی غیرت کوٹ کوٹ کر بھری تھی، اسلام اور مسلمانوں کے خلاف جب بھی کوئی دل آزار بات سامنے آتی تو وہ فوراً اس کا نوٹس لیتے اس کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتے، ۱۹۵۶ء میں بھارتیہ ودیا بھون نے بیوگرافی آف ریلیجیس لیڈرس (Biography of Religious Leaders) نامی کتاب شائع کی جس میں ازواج مطہراتؓ کی شان میں بے ہودہ، ناشائستہ اور گستاخانہ کلمات لکھے گئے تھے، شاہ صاحب نے حکومت سے اس کتاب پر پابندی عائد کرنے کا مطالبہ کیا اور حکومت کو متوجہ کیا کہ مسلمانوں کے مذہب، پیغمبر اور ان کی مقدس کتاب کی توہین کا جو سلسلہ چل پڑا ہے اسے قانون بنا کر روکا جائے، اس سے مسلمانوں کے جذبات مجروح ہوتے ہیں، انہوں نے متنبہ کیا کہ اگر یہ سلسلہ طویل ہوا تو ملک میں بدامنی پھیلے گی جو یقیناً حکومت کے مصالح کے خلاف ہوگی۔ (۲۱)

اسلام تلوار سے نہیں پھیلا

بعض مغربی اہل قلم اور مورخین نے مسلمانوں پر یہ الزام عائد کیا کہ انہوں نے اسلام کو تلوار کے زور سے پھیلایا، انہیں کے زیر اثر ہندوستان کے بعض ہندو اہل قلم بھی اپنی تحریروں میں اس بے سروپا الزام کو دہراتے حالانکہ حقیقت سے اس کا دور کا بھی واسطہ نہیں، اس کی تردید متعدد اہل قلم نے کی ہے کہ یہ مسلمانوں پر محض الزام ہے، شاہ صاحب نے بھی اس ناروا الزام کی تردید کی ہے البتہ شاہ صاحب کے دلائل زیادہ مضبوط ہیں، وہ لکھتے ہیں:

"...... یہ تلوار کی قوت نہ تھی اگر تلوار کی قوت ہوتی تو کم سے کم اسلامی حکومتوں کے دارالسلطنتوں کے علاقے پورے کے پورے مسلمان ہوتے یا ان میں مسلمانوں کی اکثریت ہوتی، حالانکہ آج بھی ان میں ہندوؤں کی اکثریت ہے پھر ہندو جیسی قدامت پرست قوم سے اس کی توقع بھی نہیں کہ وہ تلوار کے خوف سے اپنا مذہب بدل دیتی، حکومت کے اقتدار کا بھی اثر

نہ تھا، حکومت کا اقتدار صرف تہذیب و تمدن پر اثر انداز ہوتا ہے ہزاروں برس
کے راسخ عقیدہ کو نہیں بدل سکتا جب تک حکمراں قوم کے مذہب میں اثر و نفوذ
کی صلاحیت نہ ہو، اس لیے یہ صرف اسلام کی سادہ، فطری اور سچی تعلیمات
کی تاثیر اور اسلامی اخلاق کی قوت تھی جس نے ہندوستان کے ہر شعبۂ زندگی
کو متاثر کیا ہندوستان کی سرزمین توحید اور انسانی آزادی و مساوات کی پیاسی
تھی اس لیے اسلام کے ابر کرم کا چھینٹا پڑتے ہی اس کی کھیتی لہلہا اٹھی، سیکڑوں
استھانوں پر جھکنے والی پیشانیاں ایک قدوس کے سامنے جھک گئیں۔" (۲۲)

بعض اہل قلم نے خاص طور سے ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کو نشانہ بنایا اور ان کے ظلم و جبر سے اسلام پھیلانے کے فرضی واقعات لکھے تو شاہ صاحب نے ان کی بھی تردید کی اور لکھا کہ:

"ہندوستان کے مسلمان حکمراں تو مفت میں بدنام ہیں ان کو اپنی
سیاست اور حکومت کی بقا و استحکام کی فکر اور اپنے تعیشات سے اتنی فرصت اور
اتنی توفیق کہاں تھی کہ وہ اسلام کی تبلیغ کرتے اگر انہوں نے اس کی جانب
تھوڑی سی بھی توجہ کی ہوتی اور اعلیٰ طبقہ کے ہندوؤں کی دلجوئی کی جتنی کوشش کی
اگر اس کا عشر عشیر کوشش بھی ادنیٰ طبقے کی دلجوئی کے لیے ہوتی یا اینٹ اور پتھر کا
تاج محل اور لال قلعہ بنانے کے بجائے اسلام کا اخلاق محل اور سبز قلعہ بنایا ہوتا
تو آج ہندوستان کی تاریخ کچھ اور ہوتی، یہ مانا کہ تاج محل مسلمانوں کی
عظمت کا بہت بڑا نشان ہے لیکن اخلاق کا تاج محل اس سے زیادہ پائیدار
نشان ہوتا۔" (۲۳)

ہندوستان میں اشاعت اسلام کیوں کر ہوئی اس بارے میں خود مسلمانوں میں اختلاف ہے ایک حلقے کا خیال ہے کہ یہ فریضہ محدثین نے انجام دیا لیکن عام رائے یہ ہے کہ ہندوستان میں اشاعت اسلام صوفیہ کی مرہون منت ہے، شاہ صاحب کا بھی یہی نقطۂ نظر تھا

چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

''اکابر صوفیا اسلام کا صحیح نمونہ اور اخلاق و روحانیت کا پیکر تھے، اس لیے ان کا فیض عام تھا اور دوسری قومیں بھی ان سے متاثر ہوتی تھیں، چنانچہ ہندوستان میں اسلام کی اشاعت اور اس کی اخلاقی و روحانی اصلاح میں ان کا بڑا حصہ ہے، ان کے پیغام محبت نے ہندو مسلمان کو بھی ایک دوسرے سے قریب کیا، چنانچہ آج بھی ہندوستان میں تمام فرقے ان کی روحانی عظمت کے معترف اور ان سے دلی عقیدت رکھتے ہیں۔'' (۲۴)

''اسلامی ہند کی تاریخ میں صوفیائے کرام کے مذہبی و اخلاقی کارنامے مسلمان سلاطین کے سیاسی کارناموں سے کم اہم نہیں ہیں اگر ان بادشاہوں نے اپنی فتوحات سے اسلام کی شوکت و عظمت کا سکہ بٹھایا تو اقلیم روحانیت کے ان تاجداروں نے اپنے کردار و عمل سے اس کا عملی نمونہ پیش کیا اور اپنے اخلاق و روحانیت سے دلوں کی مملکت کو مسخر و منور کیا اس لیے اسلام کی اشاعت میں سب سے بڑا حصہ انہی کا ہے۔'' (۲۵)

شاہ صاحب کا خیال تھا کہ جب خانقاہی نظام میں اخلاق و روحانیت کی بجائے بدعات و خرافات نے قدم جمالئے تو وہ اپنی افادیت کھو بیٹھا اور انہی بدعات و خرافات میں صوفیہ کے اصل کارنامے بھی دب گئے، اس لیے ان کی اصلاح کی ضرورت ہے چنانچہ خود شاہ صاحب نے اس کی کوشش کی اور اپنے جد امجد شیخ احمد عبدالحق نوشہ رودولوی کی خانقاہ میں جو بدعات و رسومات نے جگہ لے لی تھی ان کی اصلاح کی۔ (۲۶)

شاہ صاحب کا یہ بھی خیال تھا کہ صوفیائے کرام کے صحیح حالات و سوانح قلم بند کرنے کی ضرورت ہے اور یہ بڑا اہم کام ہے اس لیے کہ صوفیہ کے اصل کارنامے کشف و کرامات اور متصوفانہ شطحیات میں گم ہیں اور جن سے ان کی اصل تصویر سامنے نہیں آتی، چنانچہ جب ان کے نقطۂ نظر کے مطابق جناب سید صباح الدین عبدالرحمٰن مرحوم نے ''بزم صوفیہ'' لکھی تو اس پر

انہوں نے اپنی خوشی کا اظہار کیا۔

مدارس اسلام کے قلعے ہیں

مدارس و مکاتب کے سلسلے میں شاہ صاحب کا خیال تھا کہ ہندوستان میں یہ اسلام کے قلعے ہیں جو اس کی حفاظت و پاسبانی کا فریضہ انجام دیتے ہیں ان کے علاوہ دوسری جماعتیں اور تنظیمیں اشاعت و حفاظت اسلام کی محض مدعی ہیں، وہ لکھتے ہیں:

''ہندوستان میں اسلام اور اسلامی کلچر کی حفاظت کی مدعی تو بہت سی جماعتیں ہیں لیکن درحقیقت اس کی حفاظت و پاسبانی کا اصل فرض عربی مدارس ادا کرتے ہیں اور آج ہندوستان میں دین و مذہب کا جو چرچا اور اسلامی کلچر کے جو نقوش بھی باقی ہیں وہ انہیں کی بدولت ہیں، اسلامی کلچر کے حفاظتی قلعے مسلمانوں کے پرشکوہ ایوان نہیں بلکہ غریبوں کے یہی چھونپڑے ہیں، گو مسلمانوں کی غفلت سے ان مدارس کو دنیاوی فراغت و اطمینان کے سامان بہت کم حاصل ہیں لیکن اس حالت میں بھی دین کی خدمت کا سررشتہ ان سچے خدمت گزاروں کے ہاتھ سے نہیں چھوٹا ہے اور وہ صبر و قناعت کے ساتھ برابر اپنا فرض ادا کرتے چلے جاتے ہیں۔'' (۲۷)

مدارس کے اساتذہ، طلبہ اور ذمہ داروں میں اتحاد و یک جہتی اور ہم آہنگی کی اہمیت و ضرورت سب پر عیاں ہے اور اس کے لیے کوششیں بھی کی جارہی ہیں، شاہ صاحب کو اس ضرورت کا احساس ۱۹۴۴ء ہی میں ہو گیا تھا، چنانچہ اس کی افادیت کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''ہندوستان میں اگر چہ مذہبی تعلیم کا رواج روز بروز کم ہوتا جاتا ہے لیکن خدا کو ایک جماعت سے دین کا کام لینا منظور ہے اس لیے دینی تعلیم سے مسلمانوں کی غفلت کے باوجود الحمدللہ عربی مدارس کی کافی تعداد موجود ہے ان سب کا مشترکہ مقصد دین اور دینی علوم کی خدمت ہے لیکن اس اتحاد مقصد کے باوجود ان میں باہم کوئی تنظیم اور اشتراک عمل نہیں ہے جو تعلیمی اور

دینی دونوں حیثیتوں سے ضروری ہے، عموماً ایک مدرسہ کے طلبہ، مدرسین اور
منتظمین دوسرے مدارس سے کوئی ربط و علاقہ نہیں رکھتے بلکہ ایک دوسرے
کے حالات تک سے بے خبر ہوتے ہیں جس سے ان میں اتحاد و یگانگت کے
بجائے اجنبیت اور دوری پیدا ہوتی ہے اور وہ ایک دوسرے کے تجربات اور
مفید مشوروں سے فائدہ نہیں اٹھا سکتے۔" (۲۸)

مورخین کو مشورہ

انگریزوں نے ہندوستان کی جو تاریخیں لکھیں اس میں بالقصد ایسے واقعات لکھے جن سے ہندوستان کے مختلف فرقوں کے درمیان منافرت کے جذبات پیدا ہوں اور اتحاد و یگانگت کی بجائے اختلاف و انتشار پیدا ہو اور وہ کبھی متحد نہ ہو سکیں، ان کے زیر اثر بعض ہندو مورخین نے بھی تاریخ نویسی میں یہی روش اختیار کی، آزادی کے بعد بھی جب یہ سلسلہ جاری رہا تو شاہ صاحب نے ملکی مفاد و استحکام اور سالمیت کے پیش نظر اس طرز عمل کو ناپسندیدہ قرار دیا اور لکھا کہ:

"اب ایک نیا آزاد ہندوستان تعمیر ہو رہا ہے اس لیے غلامی کے
دور کے بہت سے تصورات اور سوچنے کے طریقوں کو بدلنے کی ضرورت ہے
جس میں تاریخ بھی شامل ہے، اب محض تاریخ نگاری کا نہیں بلکہ تاریخ
سازی کا دور ہے اور اس کی ذمہ داری ہمارے مورخین پر ہے کہ وہ ایسی
تاریخیں لکھیں جو قومی وحدت اور ہندوستان کی ترقی و استحکام کے لیے مفید
ہوں نہ کہ اس کو نقصان پہونچائیں، ایسی تاریخیں لکھنا جس سے ہندوستان
کے مختلف فرقوں میں اختلاف و عناد پیدا ہو ملک کے ساتھ دشمنی ہے۔" (۲۹)

شاہ صاحب کا خیال تھا کہ انگریزوں نے ہندوؤں اور مسلمانوں میں پھوٹ ڈالنے کے لیے اسلامی عہد کی تاریخ کو عمداً غلط رنگ میں پیش کیا مگر آزادی کے بعد اس طرز عمل کو روا رکھنا کسی طرح درست نہیں، وہ لکھتے ہیں:

"آزاد اور قومی حکومت کے زمانہ میں اسی پرانی روش پر قائم رہنا
اور تاریخوں میں ایسی باتیں لکھنا جس سے مسلمانوں یا کسی فرقہ کی دل آزاری
ہوتی ہو کہاں تک مناسب اور ہندوستان کے مفاد کے مطابق ہے، افسوس
ہے کہ بڑے بڑے ہندو مورخین کا دامن بھی اس سے پاک نہیں ہے اور
مسلمانوں کے متعلق ان کے قلم پر جو بھی آجاتا ہے لکھ جاتے ہیں اور یہ نہیں
سمجھتے کہ اس کا اثر ہندوستان پر کیا پڑے گا۔" (۳۰)

شیعہ سنی اختلافات

شاہ صاحب مذہبی اختلافات کو سخت ناپسند کرتے تھے ان کا خیال تھا کہ مسلمانوں
کے مذہبی اختلاف وانتشار سے ہمیشہ ان کی قوت کو نقصان پہنچا، مسلمانوں کے سیاسی زوال کو بھی
شاہ صاحب انہی اختلافات کا نتیجہ قرار دیتے تھے۔ (۳۱)

انہوں نے شیعہ سنی دونوں کو ان اختلافات سے احتراز کرنے کا مشورہ دیا اور متنبہ کیا
کہ اگر اس کے نقصانات وہ نہ سمجھے تو ایک روز حالات خود انہیں اس کے نتائج سمجھنے پر مجبور
کردیں گے۔ (۳۲)

زمینداری

ہندوستان میں زمینداری کا نظام انگریزوں کے عہد میں قائم ہوا، آزادی کے بعد یہ
نظام یک لخت ختم کردیا گیا، شاہ صاحب نے حکومت کے اس قدم کو سخت ناپسند کیا اور لکھا کہ:

"ہندوستان کے انقلاب اور جمہوری حکومت سے جہاں بہت
سے فوائد پہونچے وہاں ایک بڑا نقصان بھی ہوا، وہ ہندوستان کے پسماندہ
طبقوں کو اونچا کرنے میں تو بڑا کام کررہی ہے لیکن زمینداری ختم کرکے اس
نے صوبے کے سیکڑوں قدیم اونچے گھرانوں کو بالکل تباہ کردیا، یہ صحیح ہے کہ
اس عوامی اور جمہوری دور میں زمینداری کا پرانا نظام قائم نہیں رہ سکتا اور خود
اس طبقہ میں بھی زوال کے سارے اسباب فراہم ہوگئے تھے، لیکن اس کو

سنبھالنا اس کا فرض تھا اور دوسرے ذرائع سے اس کی زندگی کا سامان کر سکتی تھی، جو لوگ دوسروں کی پرورش کرتے تھے آج وہ خود کوڑیوں کے محتاج ہیں، یہ طبقہ اپنی بعض خرابیوں کے باوجود قدیم تہذیبی روایات کا محافظ اور اس کا نمائندہ تھا اس کے ذریعہ ہمارے بہت سے علمی، تعلیمی اور مذہبی ادارے پرورش پاتے تھے، ان کے ساتھ ان سب پر بھی زوال آ گیا، اس انقلاب کا سب سے زیادہ اثر مسلمانوں پر پڑا ہے۔" (۳۳)

تعلیم

شاہ صاحب کے فکر و نظر کا ایک اہم پہلو تعلیم تھی جس پر وہ برابر لکھتے رہے۔ ان کا خیال تھا کہ:

"قوموں کی تعمیر و تشکیل میں تعلیم کو سب سے زیادہ دخل ہے اس سانچہ میں ملک کے نوجوانوں کے دل و دماغ ڈھلتے ہیں، اور اسی گہوارہ میں ان کے خیالات و نظریات نشو و نما پاتے اور بنتے بگڑتے ہیں اور وہ یہاں سے جو افکار و تصورات لے کر نکلتے ہیں ان کا نقش کبھی نہیں مٹتا اور انہیں کے مطابق ان کی قومی سیرت و کردار کی تشکیل ہوتی ہے اسی لیے قومی زندگی میں تعلیم اور بالخصوص ابتدائی تعلیم کا مسئلہ نہایت اہم ہے۔" (۳۴)

ان کے نزدیک مسلمانوں کی دینی تعلیم کا مسئلہ ان کی ملی موت و حیات کا مسئلہ تھا کہ اگر انہوں نے اس سے لاپرواہی اور غفلت برتی تو آئندہ نسلیں محض نام کی مسلمان رہ جائیں گی۔ (۳۵) ان کا یہ بھی خیال تھا کہ نظام تعلیم ایسا ہونا چاہیے جس سے قوم کی دماغی اور ذہنی نشو و نما ہو سکے اسی لیے وہ ہندوستان میں انگریزوں کے نظام تعلیم کو پسند نہیں کرتے تھے کہ وہ روح سے خالی تھا اور اس کا مقصد محض کلرک پیدا کرنا تھا تا کہ حکومت کا کام بہ آسانی چل سکے۔ (۳۶)

آزادی کے بعد جب جمہوری حکومت نے اپنا نظام تعلیم نافذ کیا جس میں

مسلمانوں کی تعلیمی و تہذیبی خصوصیات کا خیال نہیں رکھا گیا تو شاہ صاحب نے مسلمانوں کو متنبہ کیا کہ اب مسلمانوں کو اپنے تشخص و بقا کے لیے ضروری ہوگیا ہے کہ وہ اپنے مدارس و مکاتب قائم کریں ورنہ مستقبل میں اس کے نتائج اچھے نہ ہوں گے اور وہ اپنی مذہبی حمیت اور دینی غیرت گنوا بیٹھیں گے۔(۳۷)

صحافت

ذرائع ابلاغ و ترسیل (Media) کو جو اہم مقام آج حاصل ہے اس سے اہل علم بخوبی واقف ہیں لیکن ساٹھ برس پہلے بھی اس کی اہمیت کم نہ تھی اس وقت شاہ صاحب نے وضاحت سے لکھا تھا کہ اخبارات کو قوموں کو بگاڑنے اور بنانے میں بڑا دخل ہے، صالح اور مفید لٹریچر، مذہبی جلا اور دماغی روشنی کے لیے ضروری ہے۔(۳۸) اس اہمیت کے پیش نظر وہ ترقی یافتہ ممالک کی مثالیں دے کر لکھتے ہیں:

> ''آج دنیا میں سب سے بڑی قوت پریس کی ہے اس کے بغیر کوئی آواز مؤثر نہیں ہوسکتی اور ہندوستان کے مسلمانوں کا کوئی انگریزی اخبار نہیں، اردو کے اخبارات کی کوئی آواز نہیں، ان کی آواز خود ہندوستان کے ایک بڑے طبقے تک نہیں پہونچتی، بیرونی دنیا کا تو کوئی سوال ہی نہیں ہے جو سب سے زیادہ ضروری اور مؤثر چیز ہے۔''(۳۹)

انگریزی اخبار کی ضرورت کے احساس میں آزادی کے بعد اہل علم و دانش میں شدت پیدا ہوئی تا کہ اسلام اور مسلمانوں کے خلاف تحریروں کا جواب لکھا جائے اور اسلام کی صحیح تعلیمات سے انگریزی داں طبقہ کو واقف کرایا جائے، جیسا کہ اوپر گزرا شاہ صاحب بھی انگریزی اخبار کی اشاعت ضروری خیال کرتے اور اس کی طرف وہ برابر توجہ دلاتے رہے، ۱۹۵۲ء میں جمعیۃ علماء نے ''میسج'' (Message) کے نام سے ایک پندرہ روزہ اخبار جاری کیا تو شاہ صاحب نے اس کا ذکر معارف کے شذرات میں کیا اور لکھا کہ:

> ''مسلمانوں کے لیے ایک روزنامہ اخبار کی جس قدر ضرورت

ہے وہ ظاہر ہے مگر آج تک ان کو اس کی توفیق نہیں ہوئی اس ضرورت کے پیش نظر جمعیۃ علماء نے میسیج (Message) کے نام سے ایک پندرہ روزہ اخبار نکالا ہے اگر چہ کچھ نہ ہونے کے مقابلہ میں یہ بھی غنیمت ہے مگر اصل ضرورت روزانہ اخبار کی ہے، ہندوستان میں ہندوؤں کے درجنوں اور پاکستان میں مسلمانوں کے کئی انگریزی روزنامے نکلتے ہیں، ایسی حالت میں ہندوستان کے چار کروڑ مسلمانوں کے لیے ایک انگریزی اخبار کا چلانا کیا مشکل ہے وہ اپنی شکایتوں کے لیے زبانی شور وغوغا تو بہت کرتے ہیں مگر ان کے ازالہ کی صحیح تدبیر اختیار نہیں کرتے اگر وہ صرف اتنا کریں کہ پیسہ خرچ کر کے انگریزی کے زہریلے فرقہ پرست اخبارات کی گالیاں سننے کے بجائے ''میسیج'' (Message) کے خریدار بن جائیں تو کسی اور امداد کے بغیر وہ آسانی سے روازانہ بن سکتا ہے۔''(۴۰)

آج اگر ہم گزشتہ پچاس برس کی مسلمانوں کی تاریخ پر نظر ڈالیں تو افسوس ناک حقیقت سامنے آئے گی کہ اس سلسلہ میں چند کوششوں کے سوا مسلمان کچھ نہ کر سکے انگریزی اخبار تو درکنار اب مسلمانوں کا اپنا کوئی اردو اخبار بھی نہیں جو ان کے مسائل و مشکلات اور ان کے خیالات کی ترجمانی کر سکے۔

ترقی پسند ادب

۱۹۳۶ء میں ہندوستان میں ترقی پسند تحریک کا آغاز ہوا، گو تحریک کے بعض افکار و نظریات کی وجہ سے اسے بڑی مقبولیت ملی تاہم بعض ترقی پسندوں نے ترقی پسندی کے نام پر ادب میں عریانیت اور فحش نگاری کو رواج دینا شروع کیا، شاہ صاحب نے اسے مخرب اخلاق اور ادبی گمراہی قرار دیا چونکہ اس کی ابتداء لاہور سے ہوئی تھی اسی لیے پنجاب کے اہل قلم کو خاص طور سے اس کی طرف متوجہ کیا اور لکھا کہ:

''ترقی پسند ادب کی عریاں نویسی اور فحش نگاری کے متعلق

معارف میں لکھا جا چکا ہے اور ہندوستان کے بہت سے سنجیدہ اصحاب علم اور اہل قلم حضرات نے بھی اپنے خیالات ظاہر کئے ہیں لیکن یہ وبا برابر پھیلتی جاتی ہے اس پست اور مخرب اخلاق لٹریچر کی اشاعت میں پنجاب کے بعض ادبی رسالوں کے قدم سب سے آگے ہیں اور انہوں نے ادب لطیف کے پردہ میں ادب کثیف کی اشاعت کو مستقل مقصد بنالیا ہے جس کو کوئی سنجیدہ انسان پڑھ نہیں سکتا۔

پنجاب خصوصاً لاہور ہندوستان میں اردو ادب کی اشاعت کا سب سے بڑا مرکز ہے لیکن افسوس وہاں کے بر عکس نام نہاد ترقی پسند ادیب اپنی نافہمی سے اس کے امتیاز کو داغدار بنارہے ہیں ناصاف آبادی کے اژدحام میں جہاں وبا کا خطرہ زیادہ ہوتا ہے حفظان صحت کے اہتمام کی ضرورت زیادہ پڑتی ہے اس لیے پنجاب کی ادبی پیداوار کی نگرانی کی بڑی ضرورت ہے اور یہ فرض سب سے زیادہ وہاں کے سنجیدہ اصحاب قلم پر عائد ہوتا ہے جن کی لاہور میں کمی نہیں وہاں زمین شعر و ادب کے زمیندار بھی ہیں آسمان صحافت کے مہر بھی ہیں راہ ادب کے سالک بھی ہیں کثافتوں کی تطہیر کے لیے زمزم و کوثر بھی موجود ہیں ان کی موجودگی میں یہ ادبی گمراہی حیرت انگیز ہے اس کے نوک قلم میں بڑے بڑے فاسد مادوں کو خارج کر دینے کی قوت ہے یہ ادبی فساد تو ان کی ادنیٰ توجہ سے دور ہو سکتا ہے۔" (۴۱)

قومیت اور وطنیت

قومیت اور وطنیت کا جو تصور یورپ نے پیش کیا ہے شاہ صاحب اسے سخت ناپسند کرتے تھے، ان کا خیال تھا کہ اس تصور حیات کا لازمی نتیجہ جارحیت کے شکل میں ظاہر ہوگا، وہ لکھتے ہیں:

"اپنی قوم اور وطن سے محبت بالکل فطری اور ان کے حقوق کی

ادائیگی ایک فریضہ ہے، اس لیے مذہب نے بھی اس کی تعلیم دی ہے لیکن یورپ نے جس قومیت اور وطنیت کا صور پھونکا ہے اور اس کی پرستش کی حد تک پہونچا دیا ہے اس کا لازمی نتیجہ جارحیت ہے یہ قومیت اور وطنیت محض اپنی قوم اور اپنے وطن کی محبت و ہوا خواہی تک محدود نہیں بلکہ دوسری قوموں کے مقابلہ میں اس کی سیاسی و معاشی برتری بھی ضروری ہے، اس کا لازمی نتیجہ اقوام عالم میں کشمکش اور کمزور قوموں کی پامالی ہے کہ اس کے بغیر برتری حاصل نہیں ہو سکتی، خود یورپ میں اس نیشنلزم نے کیسی کیسی لڑائیاں برپا کیں، موجودہ بڑی قوموں کی ساری کشمکش اسی کا نتیجہ ہے اور اب یہ دیو اتنا بے قابو ہو گیا ہے کہ بقائے باہم اور پنج شیل کی کمزور زنجیروں سے قابو میں نہیں آتا۔" (۴۲)

شاہ صاحب زندگی کے مادی تصور اور مادی نصب العین کو انسانیت کی ترقی کے لیے مضر خیال کرتے تھے، ان کا یہ بھی خیال تھا کہ جب تک یہ مادی تصورات نہ بدلیں گے قوموں میں باہم اعتماد اور ایک دوسرے کے تئیں ہمدردی پیدا نہیں ہو سکتی اور اس تصور اور اس سے پیدا تمدن کا سب بڑا خسارہ شاہ صاحب کے نزدیک یہ تھا کہ اس نے انسان کو اعلیٰ درجہ کا ترقی یافتہ حیوان بنا دیا ہے۔ (۴۳) اسی طرح شاہ صاحب امپریلزم کو بھی سخت ناپسند کرتے تھے۔ (۴۴)

کمیونزم

شاہ صاحب کے نزدیک کمیونزم بھی ایک ناپسندیدہ نظریہ حیات تھا، ان کا خیال تھا کہ یہ دنیا کے لیے فتنہ ہے اور اس کی بنیاد خالص مادیت اور خود غرضی پر مبنی ہے (۴۵) اسٹالن کے بارے میں انہوں نے لکھا کہ وہ اور اس کا نظام خدا کا منکر ہے۔

اسٹالن پوری زندگی خدا کا مذاق اڑاتا رہا، جب وہ مرض موت میں گرفتار ہوا اور صحت کی ساری تدبیریں کام نہ آئیں تو اس کے لیے خدا سے دعا مانگی جانے لگی شاہ صاحب نے معارف کے ایک شذرے میں اس پر بڑی لطیف تنقید کی کہ ایک ذرا سی ٹھوکر میں خدا یاد آنے لگا۔ (۴۶)

جب دیا رنج بتوں نے تو خدا یاد آیا

کمیونسٹوں کے بارے میں شاہ صاحب کی بڑی سخت رائے تھی انہوں نے لکھا کہ
''کمیونسٹ نہ صرف مذہب وملت کے دشمن ہیں بلکہ ملک و وطن کے وفادار بھی نہیں اور کمیونزم کی قربان گاہ پر ہر چیز کو بھینٹ چڑھا دیتے ہیں۔'' (۴۷)

آزادی

شاہ صاحب آزادی اور جمہوریت کو خدا کی عطا کردہ نعمت خیال کرتے تھے لیکن اس کے لیے عدل وانصاف کو بھی وہ لازمی گردانتے تھے، ۲۶ جنوری ۱۹۵۰ء میں جب آئین کا نفاذ عمل میں آیا تو شاہ صاحب نے لکھا کہ:

> ''آزادی اور جمہوریت خدا کی نعمت ہے جو انہی قوموں کے سپرد ہوتی ہے جو اس کا حق ادا اور اس کی ذمہ داریاں پوری کرتے ہیں، اس کا سب سے بڑا حق بلا امتیاز ملک کے ہر باشندے کے ساتھ عدل وانصاف ہے جب تک حق ادا ہوتا رہے گا حکومت باقی رہے گی ورنہ واپس لے لی جائے گی، عدل کا لازمی نتیجہ سکون واطمینان، امن وخوش حالی اور ترقی ہے اور بے انصافی کا بے اطمینانی، بدنظمی، انتشار، بدامنی اور تباہی، اس لیے دنیاوی حیثیت سے بھی حکومت کی بقا اور ترقی کا مدار بھی عدل ہی پر ہے، حکومت کو دنیا کے موجودہ انقلابات سے سبق حاصل کرنا چاہیے، اس لیے آئینی جمہوریت کو حقیقی جمہوریت بنانا حکومت کا اور اس کی کامیابی کے لیے مدد کرنا ہر محب وطن کا فرض ہے۔'' (۴۸)

بابری مسجد

۱۹۴۹ء میں بابری مسجد میں مورتی رکھی گئی اور پھر اسے متنازعہ کہہ کر اس میں تالا لگا دیا گیا، نماز پر پابندی عائد کردی گئی اس صریح ظلم وزیادتی کے خلاف مسلمانوں نے احتجاج کیا اور سیکولر حکومت سے مسجد کی حیثیت بحال کرنے کی مانگ کی، اس احتجاج ومطالبے کی شاہ صاحب نے بھی تائید کی شاہ صاحب کا خیال تھا کہ اس سے مسجدوں کو مندر بنانے کا ایک سلسلہ چل

پڑے گا، ان کا یہ بھی خیال تھا کہ یہ ایک مسجد کا مسئلہ نہیں بلکہ یہ ملک و ملت کے لیے ایک بڑا چیلنج ہے، وہ لکھتے ہیں:

"بابری مسجد کے معاملہ میں حکومت بڑی بے توجہی سے کام لے رہی ہے مسلمانوں کے مسلسل احتجاج کے باوجود اب تک اس نے کوئی توجہ نہیں کی اگر اس معاملہ میں اس نے غفلت برتی تو کوئی بھی مسجد محفوظ نہ رہ جائے گی اور مسجدوں کو مندر بنانے کا دروازہ کھل جائے گا، یہ صرف ایک مسجد کا مسئلہ نہیں بلکہ ایک اصول کا سوال ہے کہ ایک سیکولر حکومت میں کسی فرقہ کی عبادت گاہیں کہاں تک محفوظ ہیں اگر بابری مسجد مسلمانوں کو واپس نہ کی گئی تو اس کے معنی یہ ہیں کہ ہندوستان میں مسلمانوں کا مذہب محفوظ نہیں ہے، اس کے بعد حکومت کس منہ سے دنیا کے سامنے اپنے غیر مذہبی ہونے کا دعوی کر سکے گی اگر الکشن کے مصالح کے بنا پر حکومت نے اس معاملہ میں کمزوری دکھائی تو فرقہ پرست اس کو لے ڈوبیں گے۔" (۴۹)

شاہ صاحب نے کان پور کی مسجد کی مثال دے کر حکومت کو آگاہ کیا کہ یہ مسئلہ ابھی بھولا نہیں ہوگا کہ محض مسجد کے غسل خانے کو لے کر ملک میں اس سرے سے اس سرے تک ایک ہنگامہ برپا ہو گیا تھا، مسلمانوں کے جذبات ابھی تک وہی ہیں، وہ لکھتے ہیں:

"کان پور کی مسجد کا واقعہ جو صرف ایک غسل خانے کا معاملہ تھا ابھی تک بھولا نہ ہوگا، مذہب کے معاملہ میں آج بھی مسلمانوں کے جذبات وہی ہیں اور مسلمان کیا کوئی فرقہ بھی اس طرح اپنی عبادت گاہ کی توہین گوارا نہیں کر سکتا اور نہ اس کی ایک چپہ زمین چھوڑ سکتا ہے تاہم مسلمانوں کو حکومت کے اعتماد پر اس وقت تک صبر و تحمل سے کام لینا چاہیے جب تک اس سے مایوسی نہ ہو جائے۔" (۵۰)

لیکن آہ! مسلمانوں کے صبر و تحمل اور حکومت پر اعتماد کے باوجود ۶ دسمبر ۱۹۹۲ء میں

بابری مسجد نہ صرف شہید کردی گئی بلکہ اس پر عارضی مندر بھی تعمیر کردیا گیا۔

کانگریس ، فرقہ پرستی اور فرقہ وارانہ فسادات

آزادی کے بعد ہندو فرقہ پرستی میں زبردست اضافہ ہوا جس کے سبب ملک میں جگہ جگہ ہندو مسلم فسادات ہونے لگے چونکہ حکومت کانگریس کی تھی اور کانگریس کو سیکولر خیال کیا جاتا تھا اور تمام قوم پرور مسلمانوں کو اس سے بڑی توقعات تھیں لیکن وہ اس پر کھری نہیں اتری، اس نے اگر چہ ملک کو جمہوری قرار دیا اور تمام فرقوں کو مساوی حقوق آئین کے ذریعہ دیئے مگر وہ خود ان کا نفاذ عمل میں نہ لاسکی۔

دوسرے قوم پرور اور محب وطن مسلمانوں کی طرح شاہ صاحب نے بھی کانگریس کی بڑھتی ہوئی فرقہ پرستی اور اس کے جنون سے آگاہ کیا اور اس کے تدارک کی تدبیریں بھی پیش کیں لیکن یہ تمام کوششیں صدائے بازگشت ثابت ہوئیں اور کانگریس کے عہد حکومت میں فرقہ پرست اور مسلم دشمن طاقتیں اپنی سرگرمیوں میں پوری طرح مسلمانوں کو نشانہ بناتی رہیں، فسادات کا لامتناہی سلسلہ چل پڑا، اردو ختم کی گئی، بابری مسجد میں مورتیاں رکھی گئیں اور وہ تمام کام ہوتے رہے جو فرقہ پرست چاہتے تھے، شاہ صاحب کا خیال ہے کہ یہ سب اس لیے ہوا کہ خود کانگریس عملاً ایک فرقہ پرست ادارہ بن گئی تھی، شاہ صاحب لکھتے ہیں:

> ''جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے کانگریس نے انہیں بالکل نظر انداز کردیا اور ان کی ایک شکایت بھی دور نہیں کی بلکہ ان کو ان کے جائز حقوق سے بھی محروم کردیا، ان کی زبان اور ان کی تہذیب مٹانے کی کوشش کی فرقہ پرور جماعتوں کو ان کے مقابلہ میں بالکل آزاد چھوڑ دیا۔'' (۵۱)

کانگریس کی یہ بے حسی اور فرقہ پروری آزادی کے فوراً بعد ہی شروع ہوگئی تھی، شاہ صاحب لکھتے ہیں:

> ''ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان کی آزادی کے بعد سے اس کو اخلاق و تہذیب اور انسانیت و شرافت سے بھی آزادی مل گئی ہے

خصوصاً مسلمانوں کے معاملہ میں کسی کی زبان وقلم پر کوئی احتساب نہیں رہ گیا ہے جس کی زبان میں جو آتا ہے کہہ گزرتا ہے اس وقت ہندوستان کے مسلمان جن مشکلات میں مبتلا ہیں اور امتحان و آزمائش کے جن حالات سے گزر رہے ہیں وہی کیا کم ہیں کہ فرقہ پرستوں نے ان کی دل آزاری کے لیے ان کے مذہب اور ان کی تہذیب کی تحقیر وتذلیل شروع کر دی ہے۔ ادھر عرصہ سے کتابوں، مضامین اور تقریروں میں علانیہ ان کے خلاف زہر اگلا جا رہا ہے مگر اس کی کوئی باز پرس نہیں کی جاتی...... آخر حکومت کب تک مسلمانوں کی توہین وتحقیر کا تماشا دیکھتی اور ان کے صبر وتحمل کا امتحان لیتی رہے گی اس کو کچھ تو اپنی سیکولرزم کی لاج رکھنا چاہیے۔''(۵۲)

کانگریس کی کمزوری کا حال ملاحظہ ہو، شاہ صاحب لکھتے ہیں:

''حکومت کی کمزوری کا یہ حال ہے کہ اس نے فرقہ پروروں کو پوری آزادی دے رکھی ہے وہ جس طرح چاہیں اقلیتوں کی جان مال اور عزت و آبرو سے کھیلیں، فرقہ پرست جماعتیں ان کے لیڈر، ان کے اخبارات علانیہ فرقہ پروری کی آگ بھڑکاتے اور اقلیتوں کے جذبات مجروح کرتے ہیں اور حکومت خاموش تماشہ دیکھتی رہتی ہے۔''(۵۳)

اس ظلم وزیادتی کے اسباب بیان کرتے ہوئے شاہ صاحب لکھتے ہیں:

''اس کا بنیادی سبب یہ ہے کہ حکومت اور کانگریس دونوں میں اکثریت فرقہ پرستوں کی ہے اس لیے زبان سے تو فرقہ پرستی کی مذمت کی جاتی ہے لیکن اس کے انسداد کی عملی کوشش نہیں ہوتی جو دو چار سچے کانگریسی رہ گئے ہیں اور دل سے فرقہ پرستی کا خاتمہ چاہتے ہیں ان کی آواز کا کوئی اثر نہیں ہے اور وہ بھی اکثریت کے خوف سے فرقہ پرستی کے خلاف عملی قدم اٹھانے کی جرأت نہیں کر سکتے، لیکن اگر جمہوریت اور سیکولرزم کا، محض دھوکا نہیں ہوا اور

حکومت ملک میں امن وامان اور دنیا کی نگاہوں میں جمہوریت کا بھرم قائم
رکھنا چاہتی ہے تو اس کو ایک نہ ایک دن کھل کر فرقہ پرستی کا سامنا کرنا پڑے گا
اور بالآخر جیت اسی کی ہوگی کہ حق بہرحال باطل پر غالب آکر رہتا ہے ورنہ
محض زبانی دعویٰ کی کوئی قدر وقیمت نہیں۔'' (۵۴)

فرقہ پرستوں نے مسلمانوں پر یہ الزام عائد کیا کہ انہوں نے آزادی کی جنگ میں
اپنا بھرپور کردار ادا نہیں کیا اس کے بہانے سے انہوں نے مسلمانوں کے جذبہ حب الوطنی کو بھی
نشانہ بنانا شروع کیا تو شاہ صاحب نے تاریخ کے اوراق پلٹ کر یہ آئینہ دکھایا کہ:

''ہندوستان کے مسلمانوں کا قدم قوم پروری اور ملک و وطن کی
خدمت میں کسی سے پیچھے نہیں رہا، انہوں نے اس زمانے میں ہندوستان کی
آزادی کا علم بلند کیا جب دوسری قوموں کے کان بھی اس آواز سے ناآشنا
تھے، پہلی جنگ آزادی کے ہیرو وہی تھے اس جنگ میں سب سے زیادہ
قربانیاں ان ہی کی ہیں اور انہی کو اس کا سب سے زیادہ خمیازہ بھگتنا پڑا اس
کے بعد جنگ آزادی کے کسی دور میں بھی وہ کسی سے پیچھے نہیں رہے،
ہندوستان کی تقسیم سے ان کی یہ قربانیاں فراموش نہیں کی جاسکتیں، جب کہ اس
کی ذمہ داری اکثریت اور خود کانگریس پر بھی ہے، مسلمانوں نے ہندوستان کو
اپنے خون جگر سے سینچ کر بنایا اور سنوارا ہے اس لیے اس سے ان کی محبت فطری
ہے اس کے لیے کسی سرٹیفکٹ کی ضرورت نہیں لیکن وہ ملک ووطن کے وفادار
ہیں غلط اندیش اور غلط کار جماعتوں اور پارٹیوں کے نہیں۔'' (۵۵)

شاہ صاحب نے نہ صرف جنگ آزادی میں مسلمانوں کی قربانیوں اور ان کی جدوجہد
کا ذکر کیا بلکہ ایک شذرے میں مسلمانوں کے ان احسانات کا بھی ذکر کیا جو ہندوستان کو محض
مسلمانوں کی بدولت حاصل ہوئے، شاہ صاحب لکھتے ہیں:

''انہوں نے ہندوستان کو توحید خالص کے تصور سے آشنا کیا،

انسانوں میں ادنیٰ و اعلیٰ کی تفریق مٹا کر اخوت و مساوات کا سبق اور انسانی غلامی سے آزادی کا پیغام دیا اور انسانیت کی عظمت قائم کی، اوہام و خرافات کی زنجیروں سے آزاد کر کے حقیقت شناس بنایا اور اس قبیل کے بہت سے نئے خیالات دیئے جس سے ہندوستان کے پرانے تصورات اور نظام زندگی میں انقلاب پیدا ہو گیا۔'' (۵۶)

مگر شاہ صاحب اور دوسرے تمام مسلمان اور سیکولر دانشوروں کی جدو جہد کا فرقہ پرستوں اور خود کانگریس پر کوئی اثر نہ ہوا اور وہ برابر قومی یک جہتی اور وطن دوستی کے جذبات کو پارہ پارہ کرتے رہے، فسادات کا جو سلسلہ انگریزوں کے زمانے میں شروع ہوا تھا آزادی کے بعد اس میں اور بھی شدت آگئی اور آئے دن فسادات ہونے لگے جس میں مسلمانوں کی بڑے جانی و مالی نقصانات ہوئے، شاہ صاحب اس پر خون کے آنسو روتے، حکومت کو متوجہ کرتے سیکولرزم اور جمہوریت کی دہائی دیتے، معارف کے شذرات میں یہ تمام واقعات محفوظ ہیں مگر اس کا کوئی اثر قائم نہ ہوا بلکہ فرقہ وارانہ فسادات وقتی اور ہنگامی ہونے کی بجائے منظم اور مرتب انداز میں ہونے لگے، ۱۹۶۴ء میں جو فسادات ہوئے ان کے بارے میں شاہ صاحب لکھتے ہیں:

''اس مرتبہ جس شکل میں اور جیسے مسلسل فسادات ہو رہے ہیں وہ اس بات کا ثبوت ہیں کہ یہ کوئی ہنگامی واقعہ نہیں بلکہ ایک مرتب اور منظم اسکیم کا نتیجہ ہیں جو مسلمانوں اور حکومت دونوں کے لیے یکساں خلاف ہے۔'' (۵۷)

تقسیم وطن کی جوئے خوں گزر جانے کے بعد چند سال فرقہ وارانہ فسادات میں کچھ کمی آگئی تھی، جس سے احساس پیدا ہوا کہ غالباً فرقہ پرستی کے عناصر ختم ہو رہے ہیں مگر درحقیقت ایسا نہیں تھا، شاہ صاحب لکھتے ہیں:

''ادھر چند سال سے ہندوستان میں کوئی بڑا فرقہ وارانہ فساد نہیں ہوا تھا اور خیال ہو چلا تھا کہ اب فرقہ پرستی دب رہی ہے اور مسلمانوں کو عزت و آبرو کے ساتھ رہنے کا موقع ملے گا مگر اس سال ہولی کے موقع پر جو فساد

ہوئے خصوصاً بھوپال اور مبارک پور میں جس طرح مسلمانوں کو ذلیل اور تباہ و برباد کرنے کی کوشش کی گئی اور پولس نے ان پر جو مظالم ڈھائے اس نے اس خیال کو غلط ثابت کر دیا اور یہ معلوم ہوا کہ حکومت کے عہدہ داروں اور امن و امان کے محافظ حکام میں بھی فرقہ پرستی سرایت کر گئی ہے۔" (۵۸)

شاہ صاحب کے شذرات کی مدد سے فرقہ وارانہ فسادات کی تاریخ مرتب کی جا سکتی ہے چونکہ ہر فساد گزشتہ فساد سے زیادہ منظم اور زیادہ تکلیف دہ ہوتا تھا اور مسلمانوں کے جانی و مالی نقصانات پہلے کے مقابلہ میں زیادہ ہوتے تھے اس لیے ہر بار آہ و بکا کی لے بھی تیز ہوتی جاتی تھی۔ ۶۴۔۱۹۶۳ء میں کلکتہ میں جو فساد ہوا اور جس میں اس وقت کے وزیر داخلہ گلزاری لعل نندہ نے فساد کے خاتمہ کے لیے بڑا اہم کردار ادا کیا تھا، اس کے بارے میں شاہ صاحب لکھتے ہیں:

"آئے دن فرقہ وارانہ فسادات جن کو انسانی دہشت گردی و درندگی کہنا زیادہ صحیح ہے، زندگی کا ایسا معمول بن گئے ہیں کہ مشکل ہی سے کوئی سال ان سے خالی جاتا ہے، ابھی جبل پور، علی گڑھ، میرٹھ کے فسادات کے زخم مندمل بھی نہیں ہوئے تھے کہ کلکتہ کے فساد نے ان سب کو بھلا دیا، اس فساد میں مسلمانوں پر جو تباہی آئی ہے اس کی تلافی کی بظاہر کوئی امید نہیں اور آئندہ کلکتہ کے مسلمانوں کا پنپنا بہت دشوار ہے اگر حکومت ہند کے وزیر داخلہ گلزاری لعل نندہ نے پوری مستعدی سے اپنا فرض ادا نہ کیا ہوتا تو معلوم نہیں مسلمانوں پر اور کیا قیامت گزر جاتی جس کے لیے وہ تحسین اور شکریہ کے مستحق ہیں اگر صوبائی حکومتیں پہلے سے اسی مستعدی کا ثبوت دیا کریں تو فساد کی نوبت ہی نہ آئے یا کم سے کم وہ سنگین صورت اختیار نہ کرنے پائے مگر ان کو تو اس وقت ہوش آتا ہے جب معاملہ قابو سے باہر ہو جاتا ہے اور فسادی اپنا کام ختم کر چکتے ہیں۔" (۵۹)

شاہ صاحب نے ان فسادات کے خاتمے کے لیے اس وقت کی کانگریس کی حکومتوں

کو متوجہ کیا، ان کی روک تھام اور تدارک کے لیے مفید اور قیمتی مشورے دیئے امن کمیٹی کا تصور بھی انہوں نے پیش کیا۔(۶۰) غرض شاہ صاحب نے نہ صرف فسادات پر صدائے احتجاج بلند کی بلکہ ان کے خاتمے کے لیے تجاویز اور مشورے بھی دیتے رہے، افسوس اس کا حاصل کچھ بھی نہ نکلا اور فسادات اب بھی ہوتے رہتے ہیں، خدا جانے کب یہ سلسلہ بند ہوگا۔



حواشی

(۱) ڈاکٹر آدم شیخ۔ شاہ معین الدین احمد ندوی علم و حلم و فضل کی شمع فروزاں ص ۱۴۳۔ انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ بمبئی ۲۰۰۱،

(۲) شذرات ماہنامہ معارف جنوری ۱۹۴۸، ص ۲

(۳) ایضاً جون ۱۹۴۹، ص ۴۰۳

(۴) ایضاً جنوری ۱۹۵۲، ص ۲۔۳

(۵) ایضاً نومبر ۱۹۷۰، ص ۳۲۲

(۶) ایضاً

(۷) ایضاً مئی ۱۹۷۰، ص ۳۲۴

(۸) ایضاً مارچ ۱۹۴۹، ص ۱۶۲

(۹) ایضاً اگست ۱۹۵۶، ص ۸۲

(۱۰) ایضاً مئی ۱۹۵۶، ص ۳۲۳۔۳۲۴

(۱۱) ایضاً اگست ۱۹۵۸، ص ۸۴

(۱۲) ایضاً فروری ۱۹۵۵، ص ۸۳

(۱۳) ایضاً اگست ۱۹۵۹، ص ۱۸۳

(۱۴) ایضاً جون ۱۹۶۰، ص ۴۰۲

(۱۵) ایضاً مارچ ۱۹۶۳، ص ۱۶۲۔۱۶۴

(۱۶) شذرات ماہنامہ معارف مئی ۱۹۵۲، ص ۳۲۲۔۳۲۳

(۱۷) ایضاً جنوری ۱۹۵۱ء، ص۲-۳
(۱۸) ایضاً ۱۹۵۲ء، ص۴
(۱۹) ایضاً جنوری ۱۹۵۲ء، ص۴
(۲۰) ایضاً نومبر ۱۹۶۵ء، ص۳۲۲
(۲۱) ایضاً ستمبر ۱۹۵۶ء، ص۱۶۲-۱۶۳
(۲۲) ایضاً دسمبر ۱۹۵۸ء، ص۴۰۲-۴۰۳
(۲۳) ایضاً دسمبر ۱۹۵۸ء، ص۴۰۴
(۲۴) ایضاً اگست ۱۹۵۶ء، ص۸۴
(۲۵) ایضاً اکتوبر ۱۹۶۰ء، ص۲۴۳
(۲۶) تعمیر حیات لکھنؤ (شاہ معین الدین احمد ندوی نمبر) ص۱۷
(۲۷) شذرات معارف مارچ ۱۹۴۴ء، ص۱۶۲
(۲۸) ایضاً
(۲۹) ایضاً نومبر ۱۹۵۹ء، ص۳۲۵
(۳۰) ایضاً اکتوبر ۱۹۵۹ء، ص۲۴۴
(۳۱) ایضاً دسمبر ۱۹۶۲ء، ص۴۰۳
(۳۲) ایضاً ستمبر ۱۹۶۴ء، ص۱۶۴
(۳۳) ایضاً مئی ۱۹۵۶ء، ص۳۲۲
(۳۴) ایضاً جنوری ۱۹۴۹ء، ص۲
(۳۵) ایضاً مئی ۱۹۷۰ء، ص۳۲۴
(۳۶) ایضاً جنوری ۱۹۴۹ء، ص۲
(۳۷) ایضاً ص۳
(۳۸) ایضاً مارچ ۱۹۴۹ء، ص۱۶۳
(۳۹) ایضاً مئی ۱۹۶۱ء، ص۳۲۴
(۴۰) ایضاً مئی ۱۹۵۲ء، ص۳۲۴
(۴۱) شذرات ماہنامہ معارف مئی ۱۹۴۴ء، ص۳۲۳

(۴۲)　ایضاً ستمبر ۱۹۷۱ء، ص ۱۶۳

(۴۳)　ایضاً فروری ۱۹۵۹ء، ص ۸۴

(۴۴)　ایضاً دسمبر ۱۹۵۵ء، ص ۴۰۴

(۴۵)　ایضاً دسمبر ۱۹۵۵ء، ص ۴۰۴

(۴۶)　ایضاً

(۴۷)　ایضاً جون ۱۹۶۰ء، ص ۴۰۳

(۴۸)　ایضاً ۱۹۵۰ء، ص ۸۲

(۴۹)　ایضاً فروری ۱۹۵۰ء، ص ۸۲-۸۳

(۵۰)　ایضاً

(۵۱)　ایضاً مارچ ۱۹۶۷ء، ص ۱۶۴

(۵۲)　ایضاً ستمبر ۱۹۵۳ء، ص ۱۶۲

(۵۳)　ایضاً اکتوبر ۱۹۶۱ء، ص ۲۴۲-۲۴۳

(۵۴)　ایضاً مئی ۱۹۵۹ء، ص ۳۲۲

(۵۵)　ایضاً جون ۱۹۶۱ء، ص ۴۰۴

(۵۶)　ایضاً جنوری ۱۹۵۹ء، ص ۴

(۵۷)　ایضاً اپریل ۱۹۶۴ء، ص ۳۴۲

(۵۸)　ایضاً اپریل ۱۹۵۹ء، ص ۲۴۲

(۵۹)　ایضاً فروری ۱۹۶۴ء، ص ۸۲

(۶۰)　ایضاً اپریل ۱۹۵۹ء، ص ۲۴۲-۲۴۴



(باب ہشتم)

مکاتیب

۱۔ شیخ الحدیث مولانا محمد زکریاؒ کے نام

............(۱)............

۲۰ر جولائی ۶۹ء دارالمصنفین اعظم گڑھ

مخدوم ومحترم السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

اس عریضہ کا مقصد جناب والا سے ہدایت ورہنمائی کی درخواست ہے۔ یہ عاجز شاہ احمد عبدالحق ردولوی کے خاندان سے تعلق رکھتا ہے اور دارالمصنفین میں کام کرتا ہے، مگر اس نسبت کے باوجود اس نا کارہ کی ساری عمر غفلت میں گزری۔ جب اصلاح حال کا خیال آیا تو نفس نے دھوکہ دیا کہ ابھی تلافی کا پورا موقع باقی ہے، اسی میں عمر ساٹھ سال سے تجاوز ہوگئی مگر اب تک غفلت کا وہی عالم ہے، فرائض وعبادات کی پابندی تو کسی نہ کسی طرح ہوتی ہے، مگر بالکل بے روح اس کا ذوق ابھی تک پیدا نہیں ہوا، نماز اور تلاوت قرآن مجید پر دنیاوی خیالات کا ہجوم رہتا ہے، اس کی جانب توجہ تام بہت کم حاصل ہوتی ہے۔ کسی مرشد، کامل کی توجہ کے بغیر اس کی اصلاح نہیں ہوسکتی، عمر میں زیادتی کے ساتھ اپنی غفلت کا احساس بڑھتا جاتا ہے۔ اگر خدانخواستہ یہ حالت قائم رہی تو مستقبل تاریک نظر آتا ہے۔ اپنی نگاہ میں جناب والا کے سوا کوئی ایسی شخصیت نظر نہیں آتی جو اس حالت میں امداد ودست گیری کر سکے۔ جناب والا سے غایت

تعلق وعقیدت برسوں سے ہے۔ عزیز گرامی مولانا علی میاں سے بارہا تذکرہ ہوتا رہا ہے۔ ان کو مجھ سے عزیزانہ تعلق ہے اس لیے انھوں نے مجھے کئی مرتبہ آپ کی خدمت میں حاضری کا مشورہ دیا، بلکہ خود ساتھ چلنے کے لیے آمادگی ظاہر کی لیکن اس کا وقت نہیں آیا تھا، اس لیے یہ سعادت اب تک حاصل نہیں ہو سکی۔ اب جناب والا کی خدمت میں حاضری کا شدت سے تقاضا ہے، اس کے لیے مناسب معلوم ہوا کہ پہلے خط وکتابت کے ذریعہ تعلق اور تعارف قائم کیا جائے، اور ایک گنہ گار خدمت والا میں حاضری کے قابل بن سکے اور جب تک اس کا موقع نہ آئے خط وکتاب کے ذریعہ اصلاح کا سلسلہ قائم رہے۔

آپ کی دعا اور تربیت کا محتاج

معین الدین

جواب:

ارادہ بہت ضروری ہے۔ انتخاب بہت غلط ہے، نااہلیت کے علاوہ لب گور ہوں۔ شیخین کے خلفاء میں سے یا خود علی میاں سے استخارہ مسنونہ کے بعد رجوع کریں۔ ابتدائی آمد علی میاں کے ساتھ ہو تو بہت اچھا ہے۔ وہ اگست کے شروع میں آنے والے ہیں۔ ایک کارڈ سے ان سے تاریخ مقرر کرلیں۔

۲۷ ربیع الثانی ۱۳۸۸ھ زکریا

............(۲)............

۳۱ رجولائی ۶۹ء دار المصنفین اعظم گڑھ۔

مخدوم مکرم دامت برکاتہم۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ

والا نامہ صادر ہوا، جناب والا کی توجہ اور حوصلہ افزائی سے فی الجملہ تشفی ہوئی۔ مجھے عرصہ سے اپنی اصلاح کے لیے کسی بزرگ سے تعلق پیدا کرنے کا خیال تھا، اسی سلسلے میں خط لکھا

ہوگا مگر ایسے اسباب وحالات پیش آتے رہے کہ اس کی نوبت نہ آسکی، بلکہ صحیح یہ ہے کہ اس کا وقت نہیں آیا تھا اور طلب صادق نہ تھی، آپ نے مولانا مدنی اور مولانا تھانوی رحمہما اللہ کے خلفاء کے بارے میں مشورہ دیا ہے، اس کے متعلق گزارش ہے کہ اولاً ان سے مجھ کو واقفیت نہیں، مولانا عبدالغنی پھولپوری اور مولانا شاہ وصی اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہما سے واقفیت تھی۔ مولانا عبدالغنی صاحب سے تو اکثر ملاقات ہوتی رہتی تھی۔ وہ دارالمصنفین تشریف لایا کرتے تھے۔ مولانا وصی اللہ صاحب کی خدمت میں بھی کئی مرتبہ حاضری ہوئی۔ ان کے علاوہ اور کسی سے واقفیت یا ان کا تجربہ نہیں ہے دوسرے میری طبیعت اور کسی طرف مائل نہیں ہوتی، علی میاں بلاشبہ اس کے اہل ہیں، مجھ کو ان سے محبت ہی نہیں بلکہ میرے دل میں ان کی بڑی وقعت ہے، ان کی مثالیں اس دور میں کم ہوں گی میں نے تو بارہا ان سے کہا ہے کہ:

ترا دیدہ و یوسف را شنیدہ
شنیدہ کے بود مانند دیدہ

لیکن میرے ان کے درمیان ایسے عزیزانہ تعلقات ہیں کہ میں ان سے فائدہ نہ اٹھا سکوں گا اور نہ وہ خود اس کے لیے آمادہ ہوں گے، اس لیے میری نگاہ آپ ہی پر پڑتی ہے اور اس رہنمائی کا سہرا بھی انھیں کے سر ہے۔

فی الحال میرا مقصد یہ ہے کہ خط و کتابت کے ذریعہ آپ کی ہدایت ورہنمائی میں اپنے کو اس کا اہل بنا سکوں، اور آپ کی توجہ سے امید ہے کہ کچھ دنوں میں قبول اصلاح کی صلاحیت پیدا ہو جائے گی۔ اس وقت جناب والا کی خدمت میں حاضری ہوگی، علی میاں تو برابر جاتے ہی رہتے ہیں، وہ ہر وقت ساتھ چلنے کے لیے آمادہ ہو جائیں گے۔ میں نے درود شریف کی پانچ تسبیحوں کا ورد شروع کر دیا ہے۔ دس بیس دن کے بعد اس کے نتائج سے مطلع کردوں گا۔

آپ کی دعا اور نظر توجہ کا طالب
ناچیز معین الدین

جواب:

مکرم ومحترم مدفیوضکم! بعد سلام مسنون!

اسی وقت گرامی نامہ موصول نہ ہوا۔ علی میاں گزشتہ ہفتہ اتوار کی صبح کو آئے تھے، کئی دن قیام کے بعد پرسوں جمعرات کی شام کو دہلی گئے۔ میں نے ان سے آتے ہی جناب کے متعلق استفسار کیا۔ میرا خیال یہ تھا کہ شاید آپ نے بندہ کے سابقہ خط کی بنا پر کوئی خط ان کو لکھ رکھا ہو مگر انہوں نے اس سے لاعلمی ظاہر کی اور یہ بھی کہا کہ آپ کا خط ان کے پاس قریب ہی میں پہنچا تھا، جس میں اس کا کوئی ذکر نہیں تھا اور جب میں نے آپ کے خط کا ذکر کیا تو انہوں نے یہ بھی ارادہ ظاہر کیا کہ وہ آپ کو تار سے بلالیں کہ ان کا کئی دن قیام کا ارادہ تھا۔ مگر میں نے یہ کہہ کر روک دیا تھا کہ معلوم نہیں وہ فوری طور پر تشریف لاسکتے ہیں یا نہیں اور یہ کہ ان کا فوری آنے کا ارادہ ہوتا تو میرا خط گئے ہوئے کئی روز ہو چکے ہیں وہ اس کے متعلق آپ کو کچھ لکھتے۔

اس ناکارہ نے جو مخلصانہ مشورہ پہلے خط میں آپ کو لکھا تھا وہ کوئی تواضع اور دفع الوقتی نہیں تھا، میرا مخلصانہ مشورہ اب بھی وہی ہے حضرت اقدس مدنی اور حضرت اقدس تھانوی نور اللہ مرقدہما کے خلفاء کی فہرستیں مع پتوں کے ملنا بہت آسان ہے۔

حضرت تھانوی نور اللہ مرقدہ کے خلفاء کی فہرست، ان کی سوانح ''اشرف السوانح'' کے ختم پر ہے اور حضرت مدنی نور اللہ مرقدہ کے خلفاء کی فہرست الجمعیۃ کے شیخ الاسلام نمبر میں مع پتوں کے موجود ہے۔ اس نابکار کا مشورہ تو اپنی نااہلیت کی وجہ سے اب بھی وہی ہے جو پہلے عرض کیا تھا۔ تاہم مجھے خط وکتابت کے ذریعہ بھی آپ کے استفسار کے جواب میں بخل نہیں ہے۔ یہ ناکارہ اپنے دوستوں کو جو ابتدائی معمولات بتایا کرتا ہے اس کا پرچہ بھی ارسال ہے۔ ان میں سے جو جو معمول بسہولت آپ اختیار کرسکتے ہیں ان کو شروع فرمادیں بیعت کوئی ضروری چیز نہیں ہے اور مدار کار بھی نہیں ہے، سہولت کی وجہ سے اختیار کی جاتی ہے۔ جناب کے متعلق میرا دوسرا مشورہ یہ ہے کہ کسی سے بھی بیعت کے سلسلہ میں جلدی نہ فرمائیں، پہلے اچھی طرح سے موانست پیدا فرمالیں، پھر طبیعت کا میلان ہو تو جیسی رائے ہو۔ اس لیے کہ بیعت کے بعد شیخ

سے انقباض یا شیخ کے دل میں انقباض ترقی سے مانع ہوا کرتا ہے۔اس سے بہت مسرت ہوئی کہ آپ نے درود شریف کا ورد شروع کر دیا ہے۔ بہت مبارک ہے۔ انشاء اللہ اس کے ثمرات خود ہی ظاہر ہو جائیں گے۔

فقط والسلام

زکریا

۷؍جمادی الاول ۸۸ھ

.............(۳).............

۹؍نومبر ۶۹ء۔ دارالمصنفین اعظم گڑھ

مخدوم و محترم دامت معالیکم

امید ہے کہ مزاج سامی مع الخیر ہوگا۔اس طرف کوئی بات قابل گزارش نہیں تھی، اس لیے عریضہ نہیں لکھا۔علی میاں سے طے ہوا تھا ان کی واپسی کے بعد ان کے ساتھ حاضری ہوگی، مگر ابھی تک واپسی کی کوئی اطلاع نہیں ہے۔ غالباً رمضان سے بالکل متصل آئیں گے۔ ایسی حالت میں شاید وہ خود بھی سہارن پور نہ جا سکیں۔ مجھے ان کی واپسی کی اطلاع ہونا اور لکھنؤ پہنچنا اور بھی مشکل ہے، اس لیے پھر حاضری کا ارادہ ملتوی کرنا پڑا۔ میرے اور علی میاں کے پروگرام میں توافق مشکل ہے، صرف یہ ایک خواہش تھی کہ پہلی حاضری ان کی معیت میں ہوتی لیکن ضروری نہیں ہے۔اس لیے آئندہ اس پر سفر موقوف نہ ہوگا۔

رمضان شریف کے عشرہ میں وطن (رودولی) جانے کا قصد ہے۔ انشاء اللہ بعد رمضان اگر علی میاں کا ساتھ ہو سکا تو فبہا ورنہ تنہا حاضری ہوگی۔ ان کے انتظار میں وقت اتنا تنگ ہو گیا ہے کہ سہارنپور جا کر رمضان سے پہلے واپسی مشکل ہے ورنہ اس طرف بھی آسانی سے ہو سکتا تھا۔ مجھے بڑی ندامت و شرمندگی ہے کہ دو مرتبہ حاضری کا ارادہ ملتوی ہو چکا ہے میں نے اس کی یہ تاویل کی ہے کہ ہر بڑے دربار کی حاضری کے کچھ آداب و شرائط ہوتے ہیں، جن

کے بغیر حاضری نہیں ہو سکتی شاید ابھی یہ آداب و شرائط پورے نہیں ہوئے ہیں، اس لیے منجانب اللہ التوا ہو رہا ہے، مگر میرا قلبی تعلق جناب والا سے ہو چکا، اصل چیز یہی ہے، صرف اس کی حاضری باقی ہے وہ بھی ضروری ہے اور اپنے وقت سے ہو جائے گی۔ انشاء اللہ

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اپنے کچھ معمولات جو عرصہ سے جاری ہیں عرض کر دوں۔ روزانہ تلاوت کلام پاک کے بعد مناجات مقبول مع اسمائے حسنیٰ پڑھتا ہوں۔ اوابین کی بھی پابندی ہے۔ تہجد کی توفیق رمضان کے علاوہ نہیں ہوتی لیکن بعد عشاء چار رکعت نفلیں پڑھ لیتا ہوں۔ بعد نماز مغرب تقریباً پونہ گھنٹہ مشی کرتا ہو، اس میں استغفار، لا الہ الا اللہ، سبحان اللہ و بحمدہ، لا حول و لا قوۃ الا باللہ العلی العظیم، حسبی اللہ لا الہ الا ھو علیہ توکلت وھو رب العرش العظیم، ربنا لا تزغ قلوبنا بعد اذ ھدیتنا وھب لنا من لدنک رحمۃ انک انت الوھاب، ربنا آتنا فی الدنیا حسنۃ و فی الآخرۃ حسنۃ، اللھم اسئلک العفو و العافیۃ فی دینی و نفسی و اھلی و مالی۔ اور اس قسم کی بعض دعائیں اور ان کے اول و آخر درود شریف پڑھتا ہوں۔ یہ معمول برسوں سے جاری ہے کسی کی ہدایت سے نہیں بلکہ محض اپنے ذوق سے۔ اگر مناسب ہو تو اس کو جاری رکھا جائے ورنہ بند کر دیا جائے اور اس کے بجائے کوئی اور درود تجویز فرمایا جائے۔

آپ کی دعاؤں کا خواستگار

معین الدین

..........(۴)..........

۲۲ رجنوری ۶۰ء ۔ دارالمصنفین اعظم گڑھ

مرشدی و مطاعی السلام علیکم

امید ہے کہ مزاج سامی مع الخیر ہوگا۔ واپسی کے بعد فوراً عریضہ لکھنے کا قصد تھا مگر درمیان میں لکھنؤ، دریاباد اور رودولی کئی جگہ جانا پڑا۔ آب و ہوا کی تبدیلی سے راستہ ہی میں انفلوئنزا کا اثر ہو گیا تھا جو اعظم گڑھ پہنچ کر بہت بڑھ گیا ہفتہ ڈیڑھ ہفتہ اس میں مبتلا رہا۔ ابھی

طبیعت پوری طرح صاف نہیں ہے، لیکن الحمد للہ تکلیف ختم ہوگئی ہے، اس لیے عریضہ لکھنے میں تاخیر ہوئی حضرت والا نے اس حقیر کے ساتھ جس لطف و کرم کا معاملہ فرمایا ہے گو وہ اس کا مستحق نہیں تھا لیکن اس کو اپنے لیے فال نیک سمجھتا ہے اور امید ہے کہ حضرت کی توجہ سے اس سیاہ کار کی باطنی اصلاح بھی ہوگی۔ اس حقیر کو اس سے بڑا اطمینان ہوا کہ اس نے اپنے خاندانی سلسلہ کے شیخ وقت کا دامن پکڑا ہے، اس لیے وہ ان بزرگوں کے طفیل میں ان کی نعمت سے محروم نہ رہے گا۔ ابھی سفر اور علالت کی وجہ سے نئے معمولات شروع نہیں کر سکا، انشاء اللہ صحت کے بعد عمل ہوگا۔ اس کے بعد تفصیلی حال عرض کیا جائے گا۔ گو اس راہ میں اصلی چیز محنت ہے لیکن شیخ کی توجہ بڑی چیز ہے، اس لیے حضرت والا اس ناکارہ کی اصلاح کے لیے دعا فرماتے رہیں۔

طالب دعا
معین الدین

............(۵)............

۱۵ر ذیقعدہ ۸۸ھ۔ ۳ر فروری ۱۹۶۰ء

مرشدی و مطاعی دامت برکاتہم، السلام علیکم!

والا نامہ ملا۔ جس لطف و کرم کے ساتھ آپ یاد فرماتے ہیں اس سے بڑی شرمندگی ہوتی ہے، مگر آپ کی توجہ اس عاجز کے لیے فال نیک ہے، اس عریضہ کا مقصد دوازدہ تسبیح کے بعض شبہوں کی وضاحت ہے۔ اسم اللہ سمیت ۱۳ مرتبہ قل هو الله پڑھنے کا کیا مقصد ہے۔ یعنی قل ھو اللہ کے علاوہ ۱۳ مرتبہ اسم اللہ پڑھا جائے اور صرف قل هو الله احد پڑھا جائے یا پوری سورہ اخلاص؟ لا الہ الا اللہ ۲۰۰ مرتبہ............ انشاء اللہ رفتہ رفتہ اوراد میں اضافہ ہوگا، مگر آپ سے تعلق ہی کا فائدہ محسوس ہو رہا ہے، اور وساوس و خطرات کے وقت آپ کا تصور سامنے آجاتا ہے۔ بس آپ کی توجہ درکار ہے۔

آپ کی دعاؤں کا طالب
ناکارہ معین الدین

(۶)

۲۱/ذی الحجہ ۸۸ھ - ۱۱مارچ ۶۰ء دارالمصنفین اعظم گڑھ

مخدومی و مرشدی دامت برکاتہم السلام علیکم و رحمۃ اللہ

امید ہے کہ حضرت والا کا مزاج بخیر ہوگا۔ تقریباً ایک مہینہ ہوا، ایک عریضہ لکھا تھا مگر اس کا جواب نہیں آیا، اس سے خیال ہوتا ہے یا یہ عریضہ نہیں پہونچا یا حضرت کا جواب مجھے نہیں ملا۔ سابق معمولات الحمد للہ جاری ہیں، رفتہ رفتہ ان میں اضافہ ہوگا۔ حضرت سے نسبت کا نمایاں فائدہ محسوس ہو رہا ہے۔ آئندہ جو حالات ہوں گے ان کو عرض کرتا رہوں گا۔ معارف میں سہارنپور کی حاضری کے بعد مختصر تاثرات لکھے تھے، ان کو بھیجنے کی ہمت نہیں پڑتی تھی، لیکن پھر خیال ہوا کہ صحافتی دیانتداری کا تقاضہ ہے کہ یہ سطور حضرت کی نظر سے گزر جانی چاہئیں۔ اس لیے آج وہ پرچہ بھجوا دیا ہے۔ خدا کرے ناپسند خاطر نہ ہوا۔ کچھ دن حضرت کی خدمت میں بسر کرنے کی بڑی خواہش ہے، انشاء اللہ آئندہ مناسب موسم بنا تو حاضری کا قصد ہے۔ امید ہے کہ اس ناکارہ کے حق میں دعا فرماتے رہیں گے۔

طالب دعا

معین الدین

جواب:

بعد سلام مسنون۔ عنایت نامہ پہنچا اور گرامی نامہ سننے کے بعد پرچہ بھی منگوا کر سنا۔ جس میں آپ نے مبالغہ فی المدح کی احادیث ممانعت سے یکسر صرف نظر فرما لیا۔ یہ آپ کی علمی شان کے مناسب نہیں تھا۔

اللہ جل شانہ اپنے فضل و کرم سے اس سیاہ کار کو قطع تعلق سے محفوظ فرمائے۔ میری درخواست ہے کہ آئندہ ایسے امور سے خاص طور سے اس ناکارہ کے بارے میں بہت احتراز فرمائیں۔

مدار خاتمہ پر ہے جس کا حال معلوم نہیں۔ اللہ جل شانہ اپنے فضل و کرم سے نصیب

فرمائے تو سب کچھ ہے ورنہ کچھ بھی نہیں آپ نے تحریر فرمایا کہ ایک مہینہ ہوا خط لکھا تھا جس میں ذکر کے متعلق دریافت کیا تھا، ہمروزہ اس کا جواب لکھوا چکا ہوں معمولات کی پابندی سے بہت مسرت ہوئی اللہ تعالی مبارک فرمائے کہ یہی اصل ہے اور ترقی کا زینہ ہے۔ الاستقامۃ فوق الکرامہ اس کا بہت ہی اہتمام فرمائیں کہ مادی غذاؤں سے روحانی غذاؤں کی پابندی زیادہ ہو۔ جیسے بلاسخت مجبوری کے چائے اور کھانے کا وقت مؤخر نہیں ہوتا، اوراد کا اہتمام اس سے زیادہ ہونا چاہیے۔ آپ نے تحریر فرمایا کہ حالات میں نمایاں فرق معلوم ہوتا ہے۔ اس سے بہت مسرت ہوئی۔ یہ آپ ہی کے اخلاص کا ثمرہ ہے، ورنہ ''من آنم کہ من دانم'' آپ نے کچھ دن یہاں قیام کرنے کی خواہش لکھی۔ سرآنکھوں پر، جب چاہیں تشریف لائیں، بشرط حیات! اگر ماہ مبارک کا کچھ وقت یہاں گزر جائے تو زیادہ اچھا ہے۔ یہ ناکارہ دعا کرتا ہے کہ اللہ جل شانہ آپ کو مکارہ سے محفوظ فرما کر دارین کی ترقیات سے نوازے۔ سلسلے کے اکابر کے فیوض و برکات سے مالامال فرمائے۔ اس ناپاک کا توسط اس میں سدراہ نہ بنے۔ خدا کرے کہ یہ خط پہنچ جائے، پہلے خط کے نہ پہنچنے سے بہت قلق ہوا۔　　فقط والسلام

حضرت شیخ الحدیث صاحب

بقلم عبدالرحیم ۲۵ ذی الحجہ ۸۸ھ

..............(۷)..............

۲۴/اگست ۱۹۷۲ء۔ دارالمصنفین اعظم گڑھ

حضرت مرشدی ومولائی السلام علیکم ورحمۃ اللہ

دو تین دن ہوئے مولانا تقی الدین صاحب تشریف لائے تھے، ان سے خیرت مزاج معلوم ہوئی تھی اور مولانا شاہد صاحب کی مرسلہ کتابیں بھی موصول ہوئیں۔

انہیں کی زبانی معلوم ہوا کہ حضرت نے علی میاں کے خط میں اس ناکارہ کو یاد فرمایا تھا۔ غالباً یہ خط ان کو بعد میں ملا، اس لیے کہ انھوں نے مجھے کچھ نہیں لکھا ہے اس خادم کو حضرت کی قدم بوسی کی برابر تمنا رہتی ہے، لیکن اب طبیعت پر ضعف اس قدر غالب ہے کہ بغیر کسی رفیق

کے سفر کی ہمت نہیں پڑتی۔ انشاء اللہ بعد برسات حاضری کا قصد ہے، گو حاضری کی نوبت کم آتی ہے لیکن حضرت سے قلبی تعلق برابر بڑھتا جاتا ہے اور دن میں کئی بار حضرت کی یاد آتی ہے اور اس میں بڑی لذت اور کیفیت محسوس ہوتی ہے، اس کو میں اپنے لیے بڑی نعمت اور فال نیک سمجھتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ حضرت کے طفیل میں اس گنہگار کا بیڑہ پار لگائے۔

آج کل حضرت کی تازہ آئی ہوئی کتابیں مطالعہ میں ہیں، ان سے استفادہ کر رہا ہوں۔ امید ہے کہ خیریت مزاج سے مطلع فرمائیں گے۔

طالب دعا

معین الدین

.........(۸).........

۲۳ر نومبر ۷۲ء۔ اعظم گڑھ

حضرت مرشدی و مولائی دامت معالیکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ

امید کہ مزاج سامی مع الخیر ہوگا۔

رمضان المبارک میں حاضری ہوگئی تھی۔ اس لیے واپسی میں زحمت دینا مناسب نہ معلوم ہوا۔ اس کے بعد بھی اب تک عریضہ ارسال کرنے کی نوبت نہ آسکی۔ جس کی ندامت ہے۔

حضرت کے یہاں اگرچہ تین ہی دن قیام رہا، لیکن اس کے انوار و برکات اب تک محسوس ہو رہے ہیں۔ ایسا روحانی منظر عمر میں پہلی مرتبہ دیکھنے میں آیا۔ اس مرتبہ رمضان المبارک میں حضرت کے تبلیغی رسائل کا مجموعہ مطالعہ میں رہا الحمد للہ اس سے بھی فائدہ پہنچا۔

حضرت کی دعاؤں سے معمولات جاری ہیں، اگر کسی خاص ورد کی ہدایت ہو تو اس پر عمل کیا جائے۔ امید ہے کہ خیریت مزاج سے مطلع فرمایا جائے گا۔

طالب دعا

معین الدین

۲۔ مفکر اسلام مولانا سید ابو الحسن علی ندویؒ کے نام

............(۱)............

عزیز گرامی!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

حضرت مولانا رائے پوری (۱) کے سانحہ ارتحال کی خبر اخبارات سے ملی تھی، آپ کو خط لکھنا چاہتا تھا مگر آپ پاکستان میں تھے اور وہاں کا پتہ معلوم نہ تھا، یقین ہے کہ اب واپس آگئے ہوں گے اس لیے لکھنؤ لکھ رہا ہوں۔

یہ حادثہ کوئی غیر متوقع نہیں تھا۔ ایک تو عمر شریف۔ پھر پیرانہ سالی کے عوارض مگر آفتاب جب بھی غروب ہوتا ہے، تاریکی کا پھیلنا لازمی ہے اب ایسے نفوس قدسیہ کتنے رہ گئے ہیں، جن کے دم سے اسلام کی روحانی شمع روشن تھی۔

حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے مدارج ومراتب کا اصل اندازہ تو وہی لوگ کر سکتے ہیں جن کو ان کی صحبت اور ان سے استفادہ کی سعادت حاصل ہوئی ہو۔ لیکن ان کی عظمت وجلالت کے لیے ان کے دامنِ تربیت سے آپ جیسی شخصیت پیدا ہوئی اب غالباً اس سلسلۃ الذہب میں اس درجہ کی کوئی شخصیت باقی نہیں رہی اس حادثہ کا اثر جو آپ پر ہوگا وہ ظاہر ہے یہ تنہا آپ کا نہیں بلکہ دنیائے سلوک وتصوف کا بہت بڑا حادثہ ہے۔

مگر یہ مقام شکر ہے کہ حضرت رحمۃ اللہ علیہ اپنے ایسے خلفاء ومتوسلین چھوڑ گئے ہیں کہ ان کے بعد بھی ان کا روحانی فیض باقی رہے۔

یا الٰہی تا ابد قائم یہ میخانہ رہے

اس موقع پر خواجہ عزیز الحسن مجذوبؒ کے کچھ اشعار جو انہوں نے غالباً اپنے مرشد کی وفات پر کہے تھے، بے اختیار زبان قلم پر آگئے، ان کا نقل کر دینا شاید مناسب حال ہوگا۔

---

(۱) مراد حضرت مولانا عبد القادر رائے پوریؒ ہے جو اپنے وقت کے مشائخ کبار میں سے تھے، حضرت مولانا دامت برکاتہم ان ہی کے خلیفۂ مجاز ہیں۔

ہجر کی شب عجب ہے شب حال یہ کیا ہے العجب
تارے ہیں روشنی نہیں چاند ہے چاندنی نہیں

شیشہ ہے جام ہے نہ خم وصل کی رونقیں ہیں گم
لاکھ سجا رہے ہو تم بزم ابھی بجی نہیں

جائیں بچشم نم کہاں اب وہ بزم جم کہاں
پہلے سا اب کرم کہاں زلف یہ زلف ہی نہیں

بیٹھا ہوں میں جھکائے سر نیچے کئے ہوئے نظر
بزم میں سب سہی مگر وہ جو نہیں تو کچھ نہیں

اے مرغ باغ آرزو کیسا ہے باغ ہائے تو
کلیاں تو گو ہیں چار سو کوئی کلی کھلی نہیں

دل میں لگائے اس کی لو کردے جہاں میں محشر ضو
شمعیں تو جل رہی ہیں سو بزم میں روشنی نہیں

معین الدین

☆☆☆☆☆

۳۔ مولانا محمد عثمان فاسمی کے نام

............(۱)............

آپ کی تضمین مل گئی انشاء اللہ شائع ہوگی امید ہے کہ سفر حج کا تیسرا نمبر آپ نے پڑھ لیا ہوگا اس میں آپ کا بھی ذکر ہے آپ کی ملاقات بہت مختصر رہی تاہم نہ ہونے کے مقابلہ میں غنیمت ہے۔

والسلام

۱۷ر ستمبر ۶۹ء

معین الدین

............(۲)............

۱۹ر دسمبر ۶۷ء

مکرمی

السلام علیکم

آپ کا خط ملا تعزیت کا شکریہ۔ مولانا مسعود علی صاحب مرحوم ادھر برسوں سے بالکل معذور ہو گئے تھے دو تین سال سے تو بالکل صاحب فراش تھے تاہم ان کا وجود غنیمت تھا ان کی وفات سے دارالمصنفین کی آخری قدیم یادگار مٹ گئی اور اس کے ایک باب کا خاتمہ ہو گیا۔ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے۔ مولانا احمد صاحب کی خدمت میں سلام علیک۔

معین الدین

............(۳)............

۶ جنوری ۶۴ء

مکرمی

السلام علیکم

آپ کا خط مل گیا تھا ادھر اس قدر مشغولیت رہی کہ ابھی تک مضمون نہ لکھ سکا جس کی

ندامت ہے۔ اب رمضان المبارک میں آپ کی خواہش کی تعمیل ہو سکے گی۔ امید ہے کہ آپ مدت میں توسیع کر دیں گے۔ مجھے صبر حد کے جلسے میں جانا ہے۔ آج تک آپ کا مدرسہ دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوا، شاہ گنج کی نوٹی فائیڈ ریا کے چیرمین صاحب سے بھی میں نے وعدہ کیا تھا کہ اس مرتبہ صبر حد جاتے ہوئے مدرسہ کو بھی دیکھتا جاؤں گا۔ انشاء اللہ میں ۱۰ جنوری ۱۱ بجے دن کی گاڑی سے شاہ گنج پہنچوں گا۔ جمعہ کی نماز آپ کی مسجد میں پڑھوں گا اور مدرسہ کی زیارت کر کے صبر حد روانہ ہو جاؤں گا۔

والسلام

معین الدین

............(۴)............

مکرمی

السلام علیکم ورحمۃ اللہ

میں کل پانی برستے میں پہونچ گیا راستہ بھر بڑی بارش تھی آپ سب حضرات کی مخلصانہ میزبانی کا شکرگزار ہوں۔ اب تو بار بار آپ کی میزبانی کا لطف اٹھانے کو دل چاہتا ہے۔ مولانا احمد صاحب کی خدمت میں سلام عرض کر دیجئے گا۔

والسلام

............(۵)............

مکرمی

السلام علیکم ورحمۃ اللہ

امید ہے کہ آپ مع الخیر ہوں گے ابھی آپ سے ملاقات ہو چکی ہے اس لیے کوئی خاص ضرورت نہیں تھی لیکن آپ کے اسٹیشن آجانے سے کچھ وقت اچھا کٹ جاتا ہے میں پرسوں جمعرات ۲۱ کو دہرہ اکسپریس سے رودولی جاؤں گا اگر موقع ملے تو آجایئے گا۔

معین الدین

۱۹ر مارچ ۶۸ء

..........(۶)..........

مکرمی

السلام علیکم

خط مل گیا ہوگا، مولانا عبدالماجد اور مولانا اویس صاحب ۱۴ کو دہرہ اکسپریس سے آئیں گے کبھی کبھی دہرہ لیٹ ہو جاتا ہے اور اعظم گڑھ کی گاڑی نہیں ملتی اس لیے شاہ گنج اسٹیشن پر ایک آدمی موجود رہنے کی ضرورت ہے تاکہ اگر اعظم گڑھ کی گاڑی چھوٹ جائے تو ان لوگوں کو بس یا ٹیکسی پر سوار کردے ممکن ہے علی میاں اسی گاڑی سے آئیں مگر وہ گونڈہ سے آئیں گے اس لیے ممکن ہے رات کو سیالدہ اکسپریس سے آئیں، ابھی ان کا پروگرام معلوم نہیں اگر آپ اس کام کو انجام دے دیں تو یہاں سے آدمی نہ بھیجا جائے۔ جواب کا انتظار رہے گا۔ ڈاکٹر محمود صاحب بھی آئیں گے مگر یہ معلوم نہیں کہ وہ دلی سے آرہے ہیں یا کہیں اور سے۔ اگر دلی سے آئے تو وہ بھی اسی ٹرین میں ہوں گے۔

والسلام

معین الدین

..........(۷)..........

۳رمئی ۶۸ء۔اعظم گڑھ

مکرمی

السلام علیکم

آپ کا خط ملا آپ کی وجہ سے مہمانوں کو بڑا آرام ملا مجھے بھی لکھنؤ جانے کی ضرورت ہے لیکن کچھ طبیعت بھی خراب ہے اور اس سخت موسم میں سفر کی ہمت نہیں پڑتی، ممکن ہے کل پرسوں تک ہمت پڑ جائے لیکن آج کل دن میں سفر کا کوئی سوال نہیں اگر جانا ہوا تو رات کو ٹرین سے ۵ مئی کو پانچ بجے یہاں سے چل کر ۷ بجے شاہ گنج پہنچوں گا اور مدرسہ میں چلا آؤں گا پھر جو مناسب گاڑی ہوگی اس سے جاؤں گا لیکن ابھی سفر طے نہیں ہے۔ زیادہ خیال نہ جانے کا ہے۔

احتیاطاً آپ کو لکھ دینا مناسب معلوم ہوا تا کہ ۵ مئی کو مدرسہ پر موجود رہیں لیکن نہ آپ اسٹیشن آیئے گا نہ کوئی اہتمام کیجئے گا۔ اس لیے کہ ابھی سفر مشتبہ ہے اگر آنا ہوا تو میں خود مدرسہ آجاؤں گا۔

معین الدین

..............(۸)..............

مکرمی

السلام علیکم

آپ کا خط ملا میں کل ہی شام کو سفر سے واپس آیا ہوں اس سے پہلے میں آپ کو لکھ چکا ہوں کہ میں نے مضمون لکھ کر بھیج دیا تھا جو ڈاک سے ضائع ہو گیا اور اس کی کوئی کاپی بھی میرے پاس نہیں ہے لیکن اس معاملہ میں آپ سے اس قدر شرمندگی ہے کہ میں انشاءاللہ دو چار دن کے اندر ضرور دوبارہ لکھ کر بھیج دوں گا مگر وہ مختصر ہوگا۔ اصل مقصود یہ ہے کہ اس مجموعہ میں دارالمصنفین کے جذبات کی بھی ترجمانی ہو جائے وہ مختصر تاثرات سے بھی ہو جائے گی۔

۱۹ر مئی ۶۴ء معین الدین

..............(۹)..............

مکرمی

السلام علیکم

آپ کا خط ملا تھا دوسرا بھجوادیا ہے یقین ہے کہ مل گیا ہوگا علی میاں، عمران خان صاحب، مولانا اویس نگرامی و مولانا عبدالماجد دریابادی، ڈاکٹر محمود صاحب دارالمصنفین آنے والے ہیں۔ ان میں کچھ لوگ کل ۳۰ ستمبر اور کچھ یکم اکتوبر کو دہرہ اکسپریس سے آئیں گے اگر خط آپ کو وقت سے مل جائے اور آپ اسٹیشن آجائیں تو ان لوگوں سے ملاقات ہو جائے گی۔ ممکن ہے ان کو بھی کچھ سہولت حاصل ہو جائے۔

۲۹ر ستمبر ۶۵ء معین الدین

............(۱۰)............

مکرمی

السلام علیکم

آپ کا مجموعہ نعت مل گیا انشاء اللہ جلد ریویو ہوگا، میرا ارادہ جولائی کے پہلے ہفتہ میں وطن جانے کا ہے تاریخ اور ٹرین سے بعد میں اطلاع کروں گا، اگر آپ اسٹیشن پر آجائیں تو ملاقات بھی ہو جائے گی اور مجھے سہولت بھی حاصل ہو جائے گی۔ مولانا احمد صاحب کی خدمت میں سلام پہنچا دیجئے گا۔

۲۷/جون ۷۳ء
معین الدین

............(۱۱)............

مکرمی

السلام علیکم

آپ کے مرسلہ پمفلٹ کے دو نسخے ملے انشاء اللہ حسب منشا ریویو ہوگا۔ آپ کی انشا پردازی اور برمحل اشعار نے اس کو ادبی مقالہ بنا دیا ہے۔

معین الدین

☆☆☆☆☆☆☆

٤۔ عبد اللطیف اعظمی مرحوم کے نام

............(۱)............

دارالمصنفین اعظم گڑھ
نمبر ۸۵

مکرمی، السلام علیکم

آج کئی دن ہوئے گرامی نامہ ملا تھا، ''معارف'' ''نئی روشنی'' کے تبادلے میں جاری کردیا گیا، غلطی سے اخبار کے دو پرچے آتے ہیں، ایک ایڈیٹر ''معارف'' کے نام اور ایک سید صاحب قبلہ (۱) کے نام، ایک پتہ کٹوا دیجئے، بے کار ایک پرچہ ضائع ہوتا ہے۔

والسلام

۲۱ راگست ۱۹۴۸ء معین الدین

............(۲)............

دارالمصنفین اعظم گڑھ
نمبر ۳۴۳

مکرمی، السلام علیکم

آپ کا خط ملا، جو اقتباسات آپ نے نقل کئے ہیں وہ واقعی نہایت ہی لغو ہیں، مگر ابھی پورا مضمون میری نظر سے نہیں گزرا، اس کو دیکھنے کے بعد پورا اندازہ ہوگا۔ للّو (۲) کا لڑکا احمد بڑا سنجیدہ اور مہذب لڑکا ہے، تعجب ہے کہ اس نے یہ خرافات کس طرح لکھ دیئے۔ اس میں اس کے لڑکپن کو زیادہ دخل ہے، ابھی لڑکا ہے، لکھنے کا شوق ہے، مگر ابھی اس کا تجربہ نہیں، ترقی پسندوں کے پھندے میں پھنس گیا ہے، بہر حال پورا مضمون پڑھنے کے بعد میں خود احمد کو تنبیہی خط لکھ دوں گا اور اگر ضرورت ہوئی تو رشید صاحب (۳) کو بھی توجہ دلاؤں گا۔ اچھا ہوا کہ آپ نے لکھ دیا۔ والسلام

۵ رمارچ ۵۷ء معین الدین احمد

---

(۱) علامہ سید سلیمان ندوی (۲) محمد فاروق نعمانی، مولانا شبلی مرحوم کے بھتیجے (۳) پروفیسر رشید احمد صدیقی

..........(۳)..........

دارالمصنفین اعظم گڑھ
نمبر ۶۰۸

مکرمی السلام علیکم

آپ کا خط ملا، آپ کی فرمائش کی تکمیل مجھ سے زیادہ بہتر مولوی عبدالباری کر سکتے ہیں، اس لیے ان سے میں نے کہہ دیا ہے، بلکہ آپ کا خط ہی ان کو دے دیا ہے۔ وہ مطلوبہ معلومات بھیج دیں گے، ''ادیب'' کے لیے مضمون لکھنے کا وقت کہاں، ان لوگوں کا بڑا تقاضا تھا، اس لیے ریڈیو کی تقریر ''شبلی خطوط کے آئینے میں'' کا پہلا مسودہ جو کسی قدر لمبا تھا، محفوظ تھا، اسی کو بھیج دیا، ورنہ ریڈیو کی تقریر میں کسی اہم مسئلے پر تفصیلی اظہار کی گنجائش کہاں نکل سکتی ہے۔

ابھی ۲۸ فروری کو شعر العجم پر ایک تقریر کرنی تھی، آج کل لکھنؤ ریڈیو نے اردو کے مشہور مصنفین پر بڑے مفید اور دلچسپ سلسلے چل رہے ہیں، یہ دونوں اسی سلسلے کی تقریریں تھیں۔ آپ کی تقریر ضرور سنتا مگر آج کل دارالمصنفین میں ریڈیو نہیں ہے اور رمضان میں باہر جا کر سننا مشکل ہے۔

والسلام
معین الدین احمد

۸ / مارچ ۶۰ء

..........(۴)..........

دارالمصنفین شبلی اکیڈمی
اعظم گڑھ، یوپی، انڈیا
نمبر ۲۹۸۶

مکرمی السلام علیکم

آپ کا خط ملا، ''جامعہ'' کا اشتہار اسی مہینے میں دے دیا جائے گا۔ پرچہ میں نے ابھی تک نہیں دیکھا۔ صباح الدین صاحب سے میں نے پوچھا وہ کہتے ہیں کہ آپ نے ان کو

دکھایا ضرور تھا مگر لانے کے لیے نہیں دیا تھا اس لیے اب بھیج دیجیے۔

آپ کا مضمون (’مولانا شبلی کے منتقد اور معتقد‘) بہت خوب تھا، مجھے بہت پسند آیا، میرے نزدیک پورے رسالے کا بیت الغزل تھا۔ نہایت متوازن مضمون ہے اور بڑا صحیح تجزیہ کیا گیا ہے۔ میں آپ کو مبارک باد لکھنے والا تھا مگر پھر کاہلی میں رہ گیا۔

اس مہینے کے شذرات صباح الدین صاحب جامعہ پر لکھیں گے، اگر پرچہ جلد آجائے تو شذرات میں اس کا ذکر بھی کر دیا جائے گا ورنہ ریویو میں دیر لگے گی۔ ’’معارف‘‘ جنوری سے تبادلے میں جاری کر دیا جائے اور امید ہے کہ سب خیریت ہوگی۔

والسلام

یکم دسمبر ۶۰ء　　　معین الدین احمد

............(۵)............

دارالمصنفین اعظم گڑھ

نمبر ۳۰۴۷

مکرمی السلام علیکم

رسالہ ’’جامعہ‘‘ پہنچ گیا، مگر اس وقت صباح الدین صاحب جامعہ پر شذرات لکھ چکے تھے اور اس کی کاپی بھی جم چکی تھی، اس لیے اس میں تو رسالے کا ذکر نہ آسکا۔ اب آئندہ کسی پرچے میں ریویو ہوگا، البتہ ’’معارف‘‘ اس مہینے سے تبادلے میں جاری کر دیا گیا ہے۔ اب آپ لوگ اس کو چلائیے۔ ایسا نہ ہو کہ سال چھ مہینے کے بعد پھر بند ہو جائے۔ خود جامعہ میں لکھنے والوں اور اب روپیہ کی بھی کمی نہیں، اس لیے کوئی دشواری نہیں ہے۔

والسلام

۱۲؍دسمبر ۶۰ء　　　معین الدین

..............(۶)..............

دارالمصنفین شبلی اکیڈمی

اعظم گڑھ۔۱۴؍اپریل ۷۳ء

مکرمی السلام علیکم

امید ہے کہ آپ مع الخیر ہوں گے۔ڈاکٹر اشفاق لکچرار اردو شبلی کالج نے ڈپٹی نذیر احمد پر ''جامعہ'' میں ایک مضمون بھیجا ہے۔مضمون اچھا اور قابلِ اشاعت ہے،اس لیے آپ خود اس کو شائع کرتے،مگر میری تحریک پر انھوں نے بھیجا ہے،اس لیے مناسب معلوم ہوا کہ میں بھی اس کے بارے میں لکھ دوں۔خدا کرے مجیب صاحب کا مزاج اب اچھا ہو۔ان کی صحت کے لیے دعا گو ہوں۔

معین الدین

..............(۷)..............

۱۳؍اپریل ۷۴ء

مکرمی السلام علیکم

آپ کے پہلے خط کا جواب دینے والا تھا کہ آج دوسرا ملا،برادرم ارشاد صاحب(۱) کی وفات کی خبر متعدد خطوط سے مل چکی تھی،بلکہ ادھر ان کی علالت کی جو تفصیلات معلوم ہوئی تھیں ان سے ہر وقت اس حادثے کا اندیشہ تھا جو بالآخر پورا ہوا۔ان کی موت سے جامعہ کی ایک پرانی یادگار اٹھ گئی۔یوں تو جامعہ میں بہت سے اعزہ اور احباب ہیں،لیکن میرے لیے ان کی وجہ سے بڑی کشش تھی۔وہ بھی میرے جانے سے بہت خوش ہوتے تھے اور دلّی آنے کا تقاضا کیا کرتے تھے،ان کی موت کا ایک دردانگیز پہلو...... کا مسئلہ ہے،اللہ تعالیٰ اس کا سامان

---

(۱)ارشادالحق صاحب جامعہ کے سابق رجسٹرار،شاہ صاحب کے عزیز تھے۔

فرمائے اور مرحوم کو اپنی بے پایاں رحمتوں سے نوازے۔ صباح الدین صاحب کا خط ان کو دے دیا تھا۔ مسعود حسین خان صاحب کی خدمت میں سلام پہنچا دیجئے گا۔

معین الدین

(۸)

دارالمصنفین شبلی اکیڈمی
اعظم گڑھ۔ ۱۵/اپریل ۷۴ء

مکرمی السلام علیکم

پرسوں خط بھیجا ہے، یقین ہے کہ مل گیا ہوگا، اس کے بعد ایک ضرورت پیش آگئی، جامعہ کے کتب خانے میں ایک کتاب "السیرة النبویه و المستشرقون" یا اس قسم کے نام کی ہے، اس کی ضروت ہے، اگر بھجوا سکیں تو بھجوا دیجئے، ورنہ مسعود حسین خاں سے کہہ کر بھجوا دیجئے، پڑھنے کے بعد واپس کر دوں گا۔

معین الدین

❋❋❋❋❋❋

مولانا قاضی اطہر مبارک پوریؒ کے نام

...........(۱)...........

دارالمصنفین اعظم گڑھ

مکرمی السلام علیکم

آپ کا خط ملا، انقلاب کا وہ پرچہ جس میں اقبال صاحب پر نوٹ تھا میری نظر سے گذرا تھا، غالباً آپ کو میرے اور اقبال صاحب کے تعلقات کا علم نہیں ہے ورنہ آپ اتنی پرزور وکالت نہ کرتے، محمد حسین انٹر کالج میگزین کا سہیل نمبر میں ہی نے مرتب کیا تھا، ان کی موج کوثر پر مفصل دیباچہ لکھا سہیل میموریل مشاعرہ کے سلسلہ میں ایک ادبی کانفرنس جس میں اقبال صاحب پر مضامین پڑھے جائیں گے میری ہی تحریک سے اور میرے انتظام میں ہورہی ہے معارف میں اقبال صاحب پر مضمون لکھنے کا ضرور وعدہ کیا تھا اور یہ ارادہ اب بھی ہے مگر مرزا احسان احمد صاحب ان پر ایک مفصل مضمون لکھ رہے ہیں جو معارف میں شائع ہورہا ہے، اگر یہ مضمون جامع ہوا تو پھر میرے لکھنے کی ضرورت نہیں ہے البتہ اگر کوئی پہلو تشنہ رہ جائے گا تو اس کو لکھا جائے گا مرزا صاحب ان کی برادری کے ان کے عزیز اور معاصر ہیں اس لئے ان کو لکھنے کا زیادہ حق ہے، امید ہے کہ اس تفصیل کے بعد آپ کی غلط فہمی دور ہوگئی ہوگی۔ والسلام

۸ر دسمبر ۵۵ء معین الدین احمد

...........(۲)...........

دارالمصنفین اعظم گڑھ نمبر ۲۹

مکرمی السلام علیکم

آپ کا خط ملا، یہ معلوم کر کے خوشی ہوئی کہ آپ کو اطمینان ہوگیا، البلاغ کا سعود نمبر آگیا ہے انشاء اللہ جلد ہی تبصرہ کیا جائے گا، اصول سرخسی کے دو نسخے مولانا ابوالوفاء صاحب

نے بھیج دیئے تھے، میں نے معارف کے شذرات میں اس کا تذکرہ بھی کر دیا تھا الاحاطہ فی اخبار غرناطہ کا پرانا ایڈیشن ہمارے یہاں ہے اور سب خیریت ہے۔ والسلام

۳ رجنوری ۵۶ء معین الدین احمد

............(۳)............

دارالمصنفین اعظم گڑھ نمبر ۱۱۲۸۹

مکرمی السلام علیکم

آپ کا خط ملا، آپ نے جس فروگذاشت کی جانب توجہ دلائی ہے وہ صحیح ہے آپ ہی کا ترجمہ صحیح ہے مجیب اللہ صاحب کا مضمون ہے میں نے اس کو سرسری دیکھ لیا تھا، وہ اس کی طباعت کے وقت موجود نہیں تھے اس لئے یہ غلطی رہ گئی میری نظر بھی نہیں پڑی۔

اب تک آپ نے عربی کتابوں کے منگانے کی کوئی سبیل نہیں نکالی، ابھی حال میں ایک فہرست بمبئی سے آئی تھی اس میں تو کوئی خاص کتاب نظر نہیں آئی، اور سب خیریت ہے اگر بقر عید میں آپ آئے تو انشاء اللہ ملاقات ہوگی، آپ کے مضامین شوق اور دلچسپی سے پڑھتا ہوں ان مضامین نے تو البلاغ کو علمی پرچہ بنادیا ہے۔ والسلام

۲۸ رجون ۵۶ء معین الدین

............(۴)............

دارالمصنفین اعظم گڑھ نمبر ۱۱۸۷۴

مکرمی السلام علیکم

کل آپ کا خط ملا اور آج کتاب موصول ہوئی، انشاء اللہ جلد ریویو کیا جائے گا مگر اکتوبر کے پرچے کے ریویو تو لکھے جا چکے اب جلد سے جلد نومبر میں ہوسکتا ہے۔

یہاں بڑی طوفانی بارش ہوئی پورے ضلع کو سخت نقصان پہنچا مگر اتفاق سے اس زمانہ

میں میں یہاں موجود نہیں تھا۔ والسلام

۲۵ ستمبر ۵۶ء معین الدین

(۵)

دار المصنفین اعظم گڑھ نمبر ۱۱۳

مکرمی السلام علیکم

البلاغ کا تعلیمی نمبر موصول ہوا، میں نے تقریباً پورا پڑھ ڈالا، یہ آپ نے بڑا کام کیا کہ مسلمانوں کی دینی تعلیم اور موجودہ تعلیمی ضروریات پر اصحاب علم وفکر مسلمانوں کے خیالات کا مجموعہ اور ہندوستان کے عربی مدارس کا تذکرہ مرتب کردیا گو اس میں تمام مدارس کا احاطہ نہیں ہے اور ہو بھی نہیں سکتا تھا تاہم اہم مدارس کے حالات آگئے ہیں خصوصاً جنوبی ہند کے مدارس کے حالات بہت مفید ہیں، ان سے ایک مخصوص دینی طبقہ کے علاوہ شمالی ہند کے اچھے خاصے پڑھے لوگ بھی کم واقف ہیں یہ کام آپ نے خوب کیا جزاک اللہ، مضامین کا حصہ بھی بہت مفید ہے آپ کا مضمون ''مسلمانوں کے ہر طبقہ اور ہر پیشہ میں علم وعلماء'' میں نے بڑی دلچسپی سے پڑھا، اس موضوع میں بڑی جدت ہے اور ایسے مضامین کی ضرورت بھی ہے جیسا کہ آپ کو خود اندازہ ہوگا ابھی اس میں اضافہ ہوسکتا ہے اس لئے اس کو مکمل کر ڈالئے بڑے کام کی چیز ہوگی، مجھے کنونشن میں شرکت نہ کرنے کا اب زیادہ افسوس ہے مولانا حفظ الرحمٰن صاحب نے غایت لطف وکرم سے بڑے اصرار سے بلایا تھا مگر میرے رہنما مولانا مسعود علی صاحب بعض مجبوریوں کی بنا پر نہ جاسکے اس لئے میرا سفر بھی نہ ہوسکا کنونشن کی غیر معمولی کامیابی سے بڑی مسرت ہے اللہ تعالیٰ اس اہم کام کو تکمیل تک پہنچائے۔ والسلام

۱۸ جنوری ۵۵ء معین الدین احمد ندوی

(۶)

دارالمصنفین اعظم گڑھ نمبر۱۸۴

مکرمی السلام علیکم

مضمون مل گیا شکریہ! ابھی میں نے پڑھا نہیں ہے جنوری میں جب کتابت کے لئے دوں گا اس وقت پڑھوں گا، آپ کا مضمون اور قابل اشاعت نہ ہوا اگر کہیں کچھ کور کسر نظر آئی تو ترمیم کردی جائے گی گو یقین ہے کہ اس کی ضرورت نہ ہوگی، اس خبر سے مسرت ہوئی کہ رجال السند والہند کی طباعت کا انتظام ہوگیا، خدا وہ دن جلد لائے کہ اس کے مطالعہ سے استفادہ کا موقع ملے۔

یہ تنہا خوری ٹھیک نہیں، علامہ تقی الدین کے شفاء الغرام کے منگانے کا میرے لئے بھی انتظام کردیجئے میں نے تو آپ سے کہہ دیا تھا کہ جب اس قسم کی کوئی (کتاب) مل سکے تو بلا تکلف دارالمصنفین کے لئے منگالیا کیجئے ہمارے کتب خانہ کی ترقی کی رفتار کئی سال سے رک گئی ہے کتابوں کے منگانے کی کوئی شکل ہی نہیں ہے اور امید ہے کہ سب خیریت ہوگی۔ والسلام

۳رد سمبر ۵۷ء معین الدین

(۷)

دارالمصنفین اعظم گڑھ نمبر۱۸۱

مکرمی السلام علیکم

شفاء الغرام مل گئی اس لطف خاص کا شکریہ، امید ہے کہ ایسے موقعوں پر آئندہ بھی یاد رکھیں گے ایک اچھی کتاب کا کتب خانہ میں اضافہ ہوا۔

اس کی رسید میں اس لئے دیر ہوگئی کہ میں وطن گیا ہوا تھا اس لئے جو صاحب لائے تھے وہ ایک مرتبہ لاکر واپس لے گئے تھے میری واپسی کے ڈیڑھ ہفتے کے بعد وہ پرسوں آئے، کتاب کی قیمت البلاغ کے پتہ سے بھیج دی ہے، رسید سے مطلع کیجئے گا، آپ کے مضمون کا پہلا نمبر جنوری کے پرچہ میں شایع ہوگیا ہے جو نظر سے گذرا ہوگا، دوسرا فروری میں نکلے گا اور امید

ہے کہ سب خیریت ہوگی۔ والسلام

معین الدین

..........(۸)..........

دارالمصنفین اعظم گڑھ نمبر۴۷ ۴۱

عزیز مکرم السلام علیکم

امید ہے کہ آپ مع الخیر ہوں گے، واپسی میں پھر آپ سے ملاقات نہیں ہوئی، معارف میں آپ نے دارالمصنفین کا پتہ تو لکھوادیا مگر ابھی تک رجال الہند والسند کے نسخے نہیں بھیجے۔

معارف میں اس کا ذکر پڑھ کر مولوی محمد رضا انصاری فرنگی محلی کو اس کے پڑھنے کا اشتیاق پیدا ہوگیا ہے مگر وہ قومی آواز کے ریویو نگار ہیں اس لئے کتابیں خرید کر پڑھنے کے عادی نہیں ہیں اگر آپ ایک نسخہ ان کو ہدیۃً بھیج دیں تو قومی آواز میں اس کا ریویو اور اشتہار بھی ہو جائے گا، مولوی رضا آدمی پڑھے لکھے ہیں اس لئے ریویو اچھا ہوگا، ان کا پتہ یہ ہے:

مولوی محمد رضا انصاری، فرنگی محل، لکھنؤ

والسلام

۲۸/اگست ۵۸ء معین الدین

..........(۹)..........

دارالمصنفین اعظم گڑھ نمبر۴۷۵ ۴۳

مکرمی السلام علیکم

آپ کا مضمون موصول ہوا، ابھی اس کو دیکھنے کا موقع نہیں ملا ہے، یہ صرف اس کی رسید ہے جس ترمیم کی ضرورت ہوگی وہ کر لی جائے گی، اس وقت آپ کے خطوط کا جواب دینا ہے اس لئے مختصر خط پر اکتفا کرتا ہوں ہاں آج دو تین (دن) ہوئے قومی آواز میں

رجال السند والہند پر بڑا مفصل تبصرہ نکلا تھا یقین ہے کہ اڈیٹر نے وہ پرچہ آپ کے پاس بھیج دیا ہوگا۔ والسلام

۲؍نومبر ۵۸ء معین الدین

............(۱۰)............

دارالمصنفین اعظم گڑھ نمبر ۴۶۳۳

عزیز گرامی السلام علیکم

آپ کا خط ملا، قومی آواز نے ریویو کا پرچہ فوراً بھیجا ہوگا غالباً ڈاک سے ضائع ہوگیا، یہاں بھی اب شاید نہ مل سکے ورنہ بھجوا دیتا، ریویو بہت اچھا تھا۔

''تاریخ اسماء الثقات'' اہم کتاب ہے، اس کو تو ٹائپ ہی میں چھپنا چاہئے خصوصاجب مولانا حبیب الرحمٰن اس کی تصحیح کر رہے ہیں تا کہ ہر حیثیت سے مکمل ہو۔

ادارہ نعمانیہ سے جو کتاب بھی چھپتی ہے، مولانا ابوالوفاء صاحب دارالمصنفین کو ضرور بھیجتے ہیں، اس لئے امید ہے کہ زیادات بھی آئے گی والسلام

۲؍دسمبر ۵۸ء معین الدین

اگر مولانا موجود ہوں تو سلام عرض کردیں گے۔

............(۱۱)............

دارالمصنفین اعظم گڑھ نمبر ۴۷۶۰

مکرمی السلام علیکم

آپ کا خط ملا، مطلوبہ کتابیں انشاء اللہ آج کل میں بھیج دی جائیں گی، سیرۃ النبی کے پورے سٹ کے خریدار کے ساتھ تو یوں ہی چھ روپے کی رعایت ہوتی ہے وہی رعایت آپ کے ساتھ ہوگی سو روپے سے کم کے خریدار کو تاجرانہ کمیشن نہیں دیا جاتا اور پھر اس کا تعلق مجھ سے ہے

بھی نہیں، مولانا مسعود علی صاحب سے میں نے بھی کہہ دیا ہے کہ جو رعایت ہو سکتی ہے وہ کر دیں
آپ کا مضمون انشاء اللہ فروری یا مارچ (میں) شروع ہوگا ابھی پڑھنے کی نوبت بھی نہیں آئی
ہے، اب ایک ہی مرتبہ پڑھا جائے گا ورنہ کاتب کو دیتے وقت پھر پڑھنا پڑے گا۔ والسلام۔

۱۸ر دسمبر ۵۸ء

معین الدین

..........(۱۲)..........

دار المصنفین اعظم گڑھ

نمبر ۲۶۴۲

مکرمی السلام علیکم

آپ کا مضمون امام ربیع بن صبیح بصری ہندی مل گیا ابھی اس کو دیکھا نہیں ہے کاتب کو دیتے وقت پڑھوں گا اس وقت محدثین کا ایک سلسلہ شروع ہو گیا ہے اس لئے دو تین مہینے کے بعد آپ کا مضمون شایع ہو سکے گا اور امید ہے کہ سب خیریت ہوگی۔ السلام

۴ر ستمبر ۵۹ء

معین الدین

سعودی عربیہ سے کتابوں کے حصول کی کوئی صورت نکالی جائے گی۔

..........(۱۳)..........

دار المصنفین اعظم گڑھ

نمبر ۲۳۷

مکرمی السلام علیکم

امید ہے کہ مضمون کی رسید آپ کو مل گئی ہوگی، آپ کا مضمون بہت پسند آیا اور اس سے عرب و ہند کے قدیم تعلقات کے نئے گوشوں پر روشنی پڑتی ہے اس لئے اس کو میں نے اپریل ہی کے پرچہ میں دیدیا ہے دو نمبروں میں آئے گا۔

مضمون سے اس کتاب کے دیکھنے کا شوق پیدا ہو گیا ہے، اس وقت تاریخ ہند کے سلسلے کی ایک کتاب جس میں ہندوستان کے متعلق عربی مصنفین کے بیانات یکجا کئے گئے ہیں

مرتب ہو چکی ہے بلکہ چھپ رہی ہے کتاب الذخائر سے اس میں بہت اہم اضافہ ہو سکتا ہے اس لئے جس طرح بھی ممکن ہو کچھ دنوں کے لئے یہ کتاب بھیج دیجئے بحفاظت واپس کردی جائے گی۔

والسلام

۲۴؍مارچ ۶۰ء معین الدین

.........(۱۴).........

دارالمصنفین، اعظم گڑھ

مکرمی السلام علیکم

اس سے پہلے آپ کا خط ملا تھا، آج کتاب موصول ہوئی میں سمجھا تھا کہ آپ نے خرید کر بھیجی ہوگی، مگر خط پڑھ کر معلوم ہوا کہ عاریۃ ہے، ایسی کتاب کا ہاتھ میں آکر نکل جانا بہت صبر آزما ہے، اس لئے آپ میرے لئے کسی دوسرے نسخہ کا جس طرح ممکن ہو انتظام کیجئے، یہ کتاب اگر کسی دوسرے شخص کی ملک ہے تو اس کا واپس کرنا ضروری ہے اور اگر آپ کی ہے تو واپس اس وقت تک نہ کی جائے گی جب تک آپ دوسرے نسخے کا انتظام نہ کردیں، آپ کی آمد کا انتظار ہے اور سب خیریت ہے۔

والسلام

۷؍مئی ۶۰ء معین الدین

علی وحسین ابھی دیکھی نہیں ہے اس قسم کی کتابیں اتنی قابل اعتناء نہیں ہوتیں کہ ان پر اتنا وقت اور محنت ضائع کی جائے، بہر حال ریویو تو کیا ہی جائے گا۔

.........(۱۵).........

دارالمصنفین، اعظم گڑھ نمبر۱۵۲۲

مکرمی السلام علیکم

آپ کا مضمون آپ کے صاحبزادے کے ذریعہ مل گیا، اتفاق سے اگست کے پرچہ

ہی میں جگہ نکل آئی اس لئے ایک نمبر اسی مہینہ میں دیدیا ہے۔

مضمون میں اصل موضوع کے متعلق معلومات کم تھے اس لئے آپ نے اس کو پورا کرنے کے لئے دوسرے متفرق معلومات سے اس کمی کو پورا کرنی کی کوشش کی ہے اس میں کوئی مضائقہ نہیں ہے لیکن جو چیزیں بالکل غیر متعلق ہیں ان کو میں نے نکال دیا ہے۔

والسلام

۲۷/جولائی ۶۰ء　　معین الدین

............(۱۶)............

دارالمصنفین، اعظم گڑھ　　نمبر ۲۴

مکرمی السلام علیکم

آپ کے دونوں مضمون مل گئے، ابھی بعض تراجم معارف میں چل رہے ہیں ان کے ختم ہونے کے بعد مارچ تک آپ کا مضمون نکل سکے گا، البتہ مصحف عثمانی کا مضمون اسی مہینہ میں شائع ہوجائے گا مولانا حبیب الرحمٰن صاحب نے آپ کے گذشتہ مضمون پر استدراک یا محاکمہ بھیجا ہے وہ فروری میں چھپے گا، مہربانی کر کے مضمون ذرا صاف لکھا کیجئے، بعض اوقات مجھے پڑھنے میں دقت ہوتی ہے کاتب کو تو اور بھی دشواری پیش آتی ہے بین السطور نہ چھوڑنے کی وجہ سے ترمیم میں بھی دشواری ہوتی۔

والسلام

۴/جنوری ۶۱ء　　معین الدین

............(۱۷)............

دارالمصنفین، اعظم گڑھ　　نمبر ۲۵۵

عزیز مکرم السلام علیکم

آپ کا خط ملا، احیاء المعارف کا تذکرہ تو میں نے صرف مولانا حبیب الرحمٰن

صاحب کی وجہ سے کیا تھا، اگر یہ حالات معلوم ہوتے تو نہ کرتا، مسند حمیدی کے تذکرے میں دو غلطیاں ہوگئی تھیں آئندہ مہینہ میں اس کی تصحیح کردی جائے گی۔

دائرۃ المعارف کی تمام مطبوعات ہمیشہ سے ہدیۃً آتی تھیں مگر ادھر دو تین سال سے اس کا سلسلہ بند ہوگیا تھا اب ان لوگوں کو لکھوں گا۔

کتابوں کا پیشگی شکریہ جس وقت آئیں گی فوراً قیمت ادا کردی جائے گی، سویٹ دیس اگر مل گیا تو بھیج دوں گا اس کا فائل محفوظ نہیں رکھا جاتا ہے ارادہ ہے کہ مارچ کے معارف میں اس بارہ میں اپنی رائے ظاہر کروں، بعض لوگوں نے اس کی حقیقت پوچھی ہے۔ والسلام

معین الدین

۱۴ر فروری ۶۱ء

............(۱۸)............

دار المصنفین، اعظم گڑھ نمبر ۴۸۵

مکرمی السلام علیکم

آپ کا خط مل گیا تھا، روزے کی سنک میں پڑا رہ گیا معارف کا وی پی بھی نہ بھیجا جاسکا آج جب آپ کے خط کا جواب لکھنے بیٹھا تو فرمائش پر بھی نظر پڑی چنانچہ آج یا کل دونوں سال یعنی ۶۰ء کے کل پرچے اور ۶۱ء کے دو پرچوں کا وی، پی روانہ کیا جائے گا اس سال کا پورا چندہ بھی شامل کرایا گیا ہے، آپ وصول تاکید کردیجئے گا تاکہ واپس نہ آئے۔ والسلام

معین الدین

۸ر مارچ ۶۱ء

............(۱۹)............

مکرمی السلام علیکم

آپ کا خط اور چربہ پہنچا، جنوری کے سویٹ دیس کے اردو اڈیشن میں مصحف عثمانی پر ایک مستقل مضمون نکلا ہے معلوم نہیں آپ کی نظر سے گذرا یا نہیں سویٹ دیس بمبئی میں کہیں نہ

کہیں آتا ضرور ہوگا تلاش کر کے دیکھ لیجئے گا، یہ پرچہ دلی سے روسی سفارت خانے سے نکلتا ہے، اگر مناسب معلوم ہوا تو پرچہ شایع کیا جائے گا۔ والسلام

۲۸ر جنوری ۶۱ء معین الدین

(۲۰)

دارالمصنفین، اعظم گڑھ نمبر ۶۳۷

مکرمی السلام علیکم

مضمون مل گیا، ابھی میں نے پڑھا نہیں ہے مگر موضوع سے معلوم ہوتا ہے کہ یقیناً اچھا گا، معارف کے علاوہ کسی رسالہ میں اس کی اشاعت کا خیال ہی کیوں دماغ میں آیا، انشاء اللہ جلد شائع ہوگا اگر اپریل کے پرچہ میں نہ نکلا تو انشاء اللہ مئی میں ضرور نکلے گا روزے کی وجہ سے اس مختصر خط پر اکتفا کیا کتاب الذخائر کا پیشگی شکریہ قبول فرمائیں۔ والسلام

معین الدین

(۲۱)

دارالمصنفین، اعظم گڑھ نمبر ۲۰۰

مکرمی السلام علیکم

آپ کا خط ملا، کتاب الذخائر والتحف کا شکریہ الهدایا مشترکۃ کے اصول پر آپ کو جو کتابیں ملیں ان میں دارالمصنفین کا بھی حصہ رکھا کیجئے، کم از کم اس کا تو ضرور خیال رکھا کیجئے کہ جو اچھی کتابیں بمبئی میں مل سکیں یا باہر سے آسکیں ان کو بغیر پوچھے دارالمصنفین بھجوادیا کیجئے باہر سے کتابیں منگانے کا کوئی ذریعہ ہی نہیں رہ گیا ہے جب سے کتب خانہ میں اضافہ نہیں ہورہا ہے، آپ کے مضمون کی پہلی قسط فروری کے پرچے میں چھپ رہی ہے میں مصحف عثمانی کے بارہ میں مارچ کے پرچہ میں اپنی رائے لکھوں گا۔ والسلام

معین الدین

(۲۲)

دارالمصنفین، اعظم گڑھ نمبر ۱۰۱۵

مکرمی السلام علیکم

میں ادھر ڈیڑھ مہینہ سے وطن میں تھا، والد صاحب علیل ہو گئے تھے، ان کی علالت کا سلسلہ تقریباً دو مہینے قائم رہا اسی میں انتقال ہو گیا انتقال کے بعد ۱۵ر جولائی کو واپس آیا تو آپ کی مرسلہ کتابیں ملیں اس لئے ان کی رسید نہ لکھ سکا، اس کی قیمت سے مطلع کیجئے تا کہ بھیج دی جائے جس مضمون کا حوالہ آپ نے دیا ہے وہ تو نہیں ملا، ڈاک سے بھیجا تھا یا شعیب کے ہاتھ۔

والسلام

۲۴ر جولائی ۶۱ء معین الدین

(۲۳)

دارالمصنفین، اعظم گڑھ

مکرمی السلام علیکم

آپ کا مضمون ملا، دونوں کی بنیاد بہت کمزور ہے، واقعات کم اور قیاسات زیادہ ہیں لیکن ایسے موضوع پر ہیں جس پر لکھنے کی آج کل ضرورت ہے اس لئے ضروری ترمیم کے بعد انشاء اللہ شائع کئے جائیں گے، اگست کا پرچہ تو چھپ چکا ہے کوشش کروں گا کہ ستمبر سے شروع ہو جائے ورنہ اکتوبر میں ضرور شائع ہوگا، آپ کے مدنی صاحبزادے سے ملاقات ہوئی تھی میں نے ان سے کہا کہ دینی تعلیم کے لئے تو وہاں جانا بیکار تھا، البتہ زبان کی مشق اور نسبت کے لئے مفید ہے انھوں نے بھی اس سے اتفاق کیا اور سب خیریت ہے۔

معین الدین

اگر اللہ تعالیٰ نے سامان فراہم کر دیا جس کی انشاء اللہ پوری توقع ہے تو اسی سال حج بیت اللہ کا ارادہ ہے اس میں آپ اور بمبئی کے دوسرے احباب کی تھوڑی سی مدد کی ضرورت ہوگی

کسی رعایت کے لئے نہیں بلکہ اگر اسی سال میرا جانا ہوا تو اسی سال جگہ مل جائے اور آخری یا اسی سے قریب کسی جہاز کیبن کلاس میں سفر ہوگا۔

............(۲۴)............

دارالمصنفین، اعظم گڑھ نمبر ۱۰۹

مکرمی السلام علیکم

آپ کا خط ملا، آپ کی مخلصانہ ہمدردی کا شکر گذار ہوں آپ کا مضمون علمائے اسلام کے القاب، مل گیا، انشاء اللہ شایع ہوگا، مگر ابھی کچھ دنوں انتظار کرنا پڑے گا ''عرب و ہند کے تعلقات بعہد رسالت'' بہت اچھا عنوان ہے یہ مضمون موجودہ حالات کے بھی مناسب ہے اس لئے اس کو ضرور لکھئے اور معارف ہی میں بھیجئے گا، کتابوں کی قیمت جب آپ چاہیں گے مل جائے گی، اگر آپ نے منع نہ کر دیا ہوتا تو میں منی آرڈر کے ذریعہ بھیج دیا ہوتا۔ والسلام

۵/ اگست ۶۱ء معین الدین

............(۲۵)............

دارالمصنفین، اعظم گڑھ نمبر ۱۱۴۱

عزیز مکرم السلام علیکم

آپ کی مرسلہ تلخیص مل گئی، پہلا مضمون بھی مل گیا، جس کی اطلاع آپ کو دے چکا ہوں یقین ہے کہ میرا خط مل گیا ہوگا انشاء اللہ تلخیص اور مضمون دونوں جلد شایع ہوں گے اب آپ کا ہر نیا مضمون پہلے مضامین سے بہتر ہوتا ہے یہ مضمون بہت پسند آیا۔

میں پہلے ہی آپ کو لکھ چکا ہوں کہ کتب خانے کے لائق جو نئی کتاب بھی آسانی سے مل سکتی ہو، آپ فوراً اس کو منگا لیا کیجئے، کتابوں کے منگانے کی دقتوں کی وجہ سے عرصہ سے نئی کتابوں کی خریداری تقریباً بند ہے جس سے کتب خانہ میں اضافہ نہیں ہو رہا ہے اور امید ہے کہ

سب خیریت ہوگی۔ والسلام

۱۲/اگست ۶۱ء معین الدین

.............(۲۶).............

دارالمصنفین، اعظم گڑھ نمبر ۲۱۰۵

عزیز مکرم السلام علیکم

خط اور مضمون ملا، اگر اس مہینہ میں آپ کی تلخیص شایع ہوئی تو پھر نومبر میں مضمون چھپے گا اور نومبر میں تلخیص چھپی تو دسمبر میں مضمون شایع ہوگا یقین یہی ہے کہ اس مہینہ میں تلخیص کی گنجائش نکل آئے گی، اب میں ریویو نہیں لکھتا کبھی مجیب اللہ صاحب لکھتے ہیں اور کبھی ضیاء الدین صاحب اس لئے مجھے آپ کی کتاب کا خیال نہیں رہ جاتا اس مہینہ کے ریویو تو لکھے جاچکے اب نومبر میں ہوگا میں مجیب اللہ صاحب سے کہہ دوں گا مگر احتیاطاً آخر اکتوبر یا شروع نومبر آپ پھر یاددہانی کردیجئے گا میں ہفتہ عشرہ کے لئے باہر جارہا ہوں والسلام

معین الدین

.............(۲۷).............

دارالمصنفین، اعظم گڑھ نمبر ۶۱

مکرمی السلام علیکم

آپ کا خط ملا، آپ کے مضمون کی پہلی قسط جنوری کے پرچہ میں چھپ رہی ہے پورا مضمون دو نمبروں میں آئے گا۔

حضرت نجم الدین کبری فردوسی والے مضمون میں جو باتیں آپ کو کھٹکی ہیں وہ صحیح ہے اس میں اس سے بھی زیادہ خرافات تھے میں نے اس کا بڑا حصہ نکال دیا، میں اس مضمون کو شایع کرنا نہیں چاہتا تھا چنانچہ مہینوں فائل میں پڑا رہا مگر مضمون نگار صباح الدین صاحب کے عزیز

ہیں انھوں نے فردوسیہ سلسلہ کے مشائخ کے حالات میں ایک (کتاب) لکھی ہے ان کو توقع تھی کہ اگر معارف میں اس کا کچھ حصہ تائیدی نوٹ کے ساتھ شایع ہو جائے تو کتاب کی اشاعت میں حکومت بہار سے کچھ مدد مل جائے گی اس لئے صباح الدین صاحب کے اصرار پر بادل ناخواستہ شایع کرنا پڑا موجودہ شکل ترمیم کے بعد ہے ورنہ اس سے بھی زیادہ عجائب تھے آپ کے مضمون کا انتظار رہے گا، نئی مطبوعات جو کتاب بھی مل سکے اس کو ضرور منگا لیجئے۔

والسلام

۹ر جنوری ۶۲ء معین الدین

............(۲۸)............

دارالمصنفین، اعظم گڑھ

مکرمی السلام علیکم

مضمون ملا، ابھی میں نے دیکھا نہیں ہے، خط صرف رسید ہے مارچ کا پرچہ نصف کے قریب لکھا جا چکا ہے اس لئے اس مہینہ میں آپ کے مضمون کی اشاعت بہت مشکل ہے انشاءاللہ اپریل سے شایع ہوگا۔

آپ کا خط پڑھنے میں تو مجھے زیادہ دشواری نہیں ہوتی لیکن کاتبوں کو دقت ہوتی ہے اور ناصاف مسودہ میں اکثر کتابت کی غلطیاں رہ جاتی ہیں اور ترمیم کے لئے جگہ باقی نہیں رہتی اس لئے میں اب ہمیشہ آپ سے خوش خط یا کم سے کم صاف لکھنے کی تاکید کرتا رہتا ہوں، اس مرتبہ یہاں بھی موسم بہت اچھا ہے اور روزے اچھے گذر رہے ہیں ہیں تماکو کے اثر کے علاوہ اور کوئی تکلیف نہیں ہے اور سب خیریت ہے کوئی نئی بات نہیں ہے۔

والسلام

۲۴ر فروری ۶۲ء معین الدین

(۲۹)

دارالمصنفین، اعظم گڑھ　　نمبر ۱۰۶۱

مکرمی السلام علیکم

آپ کا خط ملا، میں علی گڑھ گیا ہوا تھا اس لئے جواب میں تاخیر ہوئی کل ہی واپس آیا تو ڈاک میں آپ کا خط ملا۔

مذکورہ غلطی کی تصحیح کر دی جائے گی۔　　والسلام

۳/اپریل ۶۲ء　　معین الدین

(۳۰)

دارالمصنفین، اعظم گڑھ　　نمبر ۱۸۸۰

مکرمی السلام علیکم

مضمون کی دونوں قسطیں مل گئیں میں موجود نہیں تھا اس لئے رسید لکھنے میں تاخیر ہوئی خورشید میاں کا خط آیا ہے اس سے تفصیل معلوم ہوگی آج آپ ہی کے پتہ سے ان کو خط لکھ رہا ہوں ابھی ان کا نیا پتہ معلوم نہیں۔　　والسلام

۲۴/جولائی ۶۲ء　　معین الدین

(۳۱)

دارالمصنفین، اعظم گڑھ

مکرمی السلام علیکم

انقلاب کی کٹنگ پہنچ گئی شکریہ۔ یہاں کے اخبارات نے بھی لکھنا شروع کر دیا ہے، ابھی جوبلی کی تاریخ مقرر نہیں ہوئی ہے غالباً ۱۵/دسمبر سے ۲۰/تک تاریخ میں ہوگی ڈاکٹر ذاکر صاحب سے خط وکتابت ہو رہی ہے جس وقت تاریخ مقرر ہوگی فوراً اعلان کر دیا جائے گا اور

دعوت نامے بھی جاری کر دیئے جائیں گے ہم لوگ بلاوے کے منتظر بیٹھے ہیں جیسے ہی خط آیا روانہ ہو جائیں گے آپ کا مضمون اس مہینہ میں شایع ہو رہا ہے۔ والسلام

۱۵/ستمبر ۶۲ء معین الدین

............(۳۲)............

دارالمصنفین، اعظم گڑھ نمبر ۱۹۴۹

مکرمی السلام علیکم

آپ کا مضمون مل گیا، یہ تلخیص وتبصرے کے عنوان سے زیادہ موزون تھا جواب معارف میں نہیں ہوتا، بہر حال فائدے سے خالی نہیں ہے اس لئے رکھ لیا ہے، شایع تو ہو ہی جائے گا۔ والسلام

۱۷/ستمبر ۶۳ء معین الدین

............(۳۳)............

دارالمصنفین، اعظم گڑھ نمبر ۲۰۵۳

مکرمی السلام علیکم

آپ کا خط ملا، میں یکم نومبر کو اعظم گڑھ آ گیا تھا یہاں آنے کے بعد آپ کے آنے کا حال معلوم ہوا تھا، آپ سے ملاقات نہ ہونے کا افسوس ہے آپ سے ملاقات ہی کہاں ہوئی ہے جو ششماہی ہوتی ہے اس میں بھی ناغہ گیا۔

آپ کی کتاب جدت کے ساتھ چھاپی جائے گی لیکن کچھ دنوں کے بعد ابھی خود یہاں کی بعض ضروری کتابیں پڑی ہوئی ہیں ان کی طباعت کے بعد پھر آپ کی کتاب کی طباعت کی گنجایش نکل سکے گی۔

اس سال حاجیوں کی کثرت کا حال اخبارات سے معلوم ہوا تھا اگر یہی صورت حال

رہی تو آیندہ حج کے سفر میں بڑی مشکلات پیدا ہو جائے گی اس سال تو میرا سفر رہ گیا اگر ارادہ ہوتا بھی تو اس ہجوم میں جگہ ملنے کی کیا امید تھی۔ دیکھئے آیندہ سال کیا صورت ہوتی ہے اور سب خیریت ہے۔

والسلام

معین الدین

..........(۳۴)..........

دارالمصنفین، اعظم گڑھ

مکرمی السلام علیکم

امید ہے کہ آپ مع الخیر ہوں گے، بمبئی کے خطوط کے جواب آ گئے، سیٹھ عبدالعزیز صاحب کا بہت حوصلہ افزا جواب آیا ہے انھوں نے میزبانی کی بھی پیشکش کی ہے لیکن دسنوی صاحب نے لکھا ہے کہ آج کل ان کی صحت بھی کچھ خراب ہے اور تیز بارش کا موسم ہے جس سے کام میں دقت ہوگی، اس لئے کچھ دنوں کے بعد آنا مناسب معلوم ہوگا، اس لئے اب تھوڑے دن بارش کم ہونے کا انتظار کرنا پڑے گا غالباً جولائی کے آخر تک آنا ہو سکے گا۔

دوسرا مشورہ طلب مسئلہ یہ ہے کہ حکومت کویت سے امداد ملنے کی کیا شکل ہے؟ میں نے ڈاکٹر عبداللطیف صاحب کو لکھا ہے لیکن وہ شاید اس معاملہ میں زیادہ مفید نہ ثابت ہوں ان کو خود جو کچھ دینا ہوگا وہ دیدیں گے یا اپنے بعض ملنے والوں سے کچھ دلوادیں میں چاہتا ہوں کہ حکومت کویت سے کچھ ملجاتا آپ کا تعارف وہاں ہے اور وہاں کے حالات سے بھی واقفیت ہے اس لئے لکھئے کہ اس کے لئے کیا ذریعہ اختیار کیا جائے۔

والسلام

۲۰/جون ۶۴ء

معین الدین

..........(۳۵)..........

دارالمصنفین، اعظم گڑھ　　نمبر ۳۵۸۷

مکرمی السلام علیکم

میں اس طرف سفر میں تھا پرسوں واپس آیا تو ڈاک میں آپ کا خط اور مضمون ملا، انشاء اللہ جلد شایع ہوگا ندوۃ المصنفین سے آپ کے مضامین کی اشاعت کی صورت اچھی نکل آئی، انشاء اللہ تمبر کے آخر میں ملاقات ہوگی۔ والسلام

۱۸/اگست ۶۴ء　　معین الدین

..........(۳۶)..........

دارالمصنفین، اعظم گڑھ　　نمبر ۳۸۵۴

مکرمی السلام علیکم

امید ہے کہ آپ مع الخیر ہوں گے، میں ۱۴/نومبر کو اعظم گڑھ پہنچا اس وقت آپ واپس جاچکے تھے، بمبئی میں آپ کی بڑی کمی محسوس ہوئی، اور بعض کام آپ کی وجہ سے نہ ہوسکے، بھیمڑی میں کئی لائف ممبروں کی امید تھی، وہاں جانے کا خیال بعد میں آیا لیکن اس وقت مصطفیٰ فقیہ صاحب وہاں موجود نہ تھے اور وقت بہت کم رہ گیا تھا اس لئے بھیمڑی کا سفر رہ گیا، معلوم ہوا تھا کہ وہاں آپ کا اثر ہے اور آپ کے ذریعہ بعد میں بھی کام ہوسکتا ہے اس لئے اب آپ اس کام کو انجام دیجئے ورنہ آپ کی کوشش کا صفحہ بالکل سادہ رہ جائے گا، دو لائف ممبر مولوی مختار احمد صاحب ندوی نے بنوائے آپ کا کوٹا تو بہرحال ان سے زیادہ رہنا چاہئے، میں نے اس مہینہ کے معارف میں بھی اس کا تذکرہ کردیا ہے اس وقت وقت کی تنگی کی وجہ سے سیٹھ احمد غریب صاحب سے بھی مدد نہ مل سکی لیکن انھوں نے وعدہ کیا تھا کہ وہ اپنے حلقۂ اثر میں کوشش کریں گے، اس کی ذمہ داری سیٹھ احمد ماچس والا نے لی تھی، لیکن آپ سیٹھ احمد غریب صاحب سے زیادہ قریب ہیں اس لئے آپ بھی ان کو آمادہ کیجئے ابھی سیٹھ عبدالعزیز صاحب اور دسنوی

صاحب کی کوشش کا سلسلہ بھی جاری ہے اور جوبلی تک جاری رہے گا اس لئے آپ بھی تلافی مافات کی کوشش کیجئے خصوصاً بھیمڑی میں کچھ لائف ممبر ضرور دیجئے اس کام میں تو آپ اگر نمایاں نہیں تو کچھ نہ کچھ حصہ ضرور ہونا چاہئے ورنہ آپ کے بمبئی کے قیام سے کیا فائدہ اور یہاں سب خیریت ہے۔ والسلام

۲۶ر نومبر ۶۴ء معین الدین۔

............(۳۷)............

دارالمصنفین، اعظم گڑھ نمبر ۱۱۹۸

مکرمی السلام علیکم

آپ کا مضمون ملا، کتاب الحجہ پر آپ کا تبصرہ صدق میں دیکھ چکا تھا، مفصل تبصرہ معارف ہی کے لائق تھا، انشاء اللہ نومبر کے پرچہ میں شائع ہوگا۔

ایک عازم حج پانی کے جہاز سے سفر کا ارادہ رکھتے تھے مگر ابھی تک ان کو کوئی ساتھی نہیں مل سکا اس لئے شاید پانی کے جہاز سے نہ جا سکیں، ان کو فرسٹ کلاس کیبن میں سفر کرنا ہے اس کے اور ہوائی جہاز کے کرایہ میں تھوڑا ہی سا فرق ہے اور ہوائی سفر میں کرایہ کی زیادتی دوسرے مصارف میں کمی سے پوری ہو جاتی ہے اس لئے اب غالباً ان کا سفر ہوائی جہاز کے ذریعہ ہوگا معلوم یہ کرنا ہے کہ اس کا ریزرویشن کب تک ہوگا اور اس میں آپ کیا مدد دے سکتے ہیں۔ والسلام

۲۳ر ستمبر ۶۵ء معین الدین

(۳۸)

دارالمصنفین، اعظم گڑھ نمبر ۱۴۲۶۰

مکرمی السلام علیکم

آپ کا خط ملا، میری دونوں فرسٹ کلاس کی درخواستوں کی منظوری ایک ہفتہ سے زیادہ ہوا آگئی مگر تیسری درخواست کا جوڈک کلاس کے لئے تھی اب تک کوئی جواب نہیں آیا جس سے تردد پیدا ہوگیا ہے حالاں کہ اس درخواست کو قانوناً بھی منظور ہونا چاہئے، اول تو ہر فرسٹ کلاس کے مسافر کو اپنے ساتھ دوڈک کلاس کے مسافر لے جانے کی اجازت ہے دوسرے ڈک کلاس کے مسافر، فرسٹ کلاس کی مسافر خانوں کے لڑکے ہیں جو بحیثیت محرم کے ساتھ جارہے ہیں مگر غلطی یہ ہوئی تھی کہ دونوں کی درخواستیں الگ الگ تھیں، میں نے مفتی عتیق الرحمن صاحب کو خط لکھا ہے دیکھئے کیا نتیجہ نکلتا ہے خدا کرے آپ کی درخواست بھی کسی نہ کسی صورت سے منظور ہوجائے، آپ کی وجہ سے مجھے بھی تقویت رہتی جہاز پر نہ سہی مکہ ومدینہ میں ساتھ ہوجاتا۔ اور سب خیریت ہے، کوئی نئی بات نہیں ہے۔ والسلام

۲۴ر نومبر ۶۵ء معین الدین

(۳۹)

مکرمی السلام علیکم

آپ کا خط ملا، مجھے تو یاد نہیں آتا کہ مجھ سے ثقافت والوں نے ترجمہ کی اجازت لی ہو میں نے جب ان کا ترجمہ دیکھا تھا تو سمجھا تھا کہ آپ سے اجازت لی ہوگی، خدا کرے آپ کا درخواست منظور ہوجائے آپ کی رفاقت سے مجھے بڑی مدد ملے گی مجھے ۱۳ر مارچ کے اسلامی جہاز میں جگہ ملی ہے حالانکہ میں نے فروری میں مظفری یا محمدی کے لئے لکھا تھا مغل لائن والوں کا عجب حال ہے یہ بھی غنیمت ہے ورنہ درخواست نہ منظور ہوتی تو کیا کرلیتا۔ والسلام

۲۰ر جنوری ۶۶ء معین الدین

(۴۰)

دار المصنفین، اعظم گڑھ　　نمبر ۱۰۲۹

مکرمی السلام علیکم

آپ کا خط ملا، آپ کا تبصرہ محفوظ ہے، انشاء اللہ اکتوبر کے پرچہ میں چھپے گا، اصل میں میں اس کو بالکل بھول گیا تھا، آپ نے یاددلایا تو یاد آیا، تلاش کیا تو فائل میں ملا، میں کل لکھنو جارہا ہوں مکان ہوتے ہوئے وسط ستمبر میں واپسی ہوگی اور سب خیریت ہے　والسلام

یکم ستمبر ۶۶ء　　معین الدین

(۴۱)

دار المصنفین، اعظم گڑھ　　نمبر ۱۸۲

مکرمی السلام علیکم

خط اور مضمون ملا، عہد صحابہ کی فتوحات ہند کا تذکرہ تو اردو کی بہت سی کتابوں میں آچکا ہے خود سیر الصحابہ اور تاریخ اسلام میں موجود ہے البتہ آپ نے ان کو یکجا کردیا ہے، بہرحال آپ کی محنت ضایع نہ ہوگی، انشاء اللہ شایع کیا جائے گا مگر کچھ دنوں کے بعد ابھی بہت سے ضروری اور پہلے سے آئے ہوئے مضامین رکھے ہیں۔

سعید انصاری صاحب اور جامعہ کے اور کئی اصحاب اس سال حج کو جارہے ہیں ۱۱ر یا ۱۲ر کو دہلی سے روانہ ہوں گے سعید صاحب سے تو آپ کی ضرور ملاقات ہوگی میری طرف سے بھی الوداع کہہ دیجئے گا۔　والسلام

۹ر فروری ۶۷ء　　معین الدین

(۴۲)

دارالمصنفین، اعظم گڑھ　　　　نمبر ۱۴۱۰

مکرمی السلام علیکم

آپ کا خط ملا، صباح الدین کی علالت سے اس طرف بڑی پریشانی رہی اور اب بھی ہے مثانہ کے آپریشن کے لئے پٹنہ گئے ہیں دعا کیجئے کہ آپریشن کامیاب ہو اور اللہ تعالیٰ ان کو صحت وعافیت کے ساتھ واپس لائے، ان کی علالت اور عدم موجودگی، یہاں بالکل تنہائی ہے مولوی مسعود علی صاحب مرحوم گو بالکل معذور ہو چکے تھے پھر بھی ان کے گھر کی وجہ سے آبادی تھی وہ سب بھی چلے گئے اب میرے سوا کوئی نہیں ہے اس لئے جب تک صباح الدین صاحب واپس نہ آجائیں کہیں آجا بھی نہیں سکتا، آپ کے صاحبزادے کئی دن ہوئے آپ کی نئی کتاب ”عرب وہند عہد رسالت میں“ دے گئے، خالد سلمہ کے نیا تقرر سے دلی مسرت ہے، اللہ تعالیٰ ان کو کامیاب فرمائے غالباً کسی درسگاہ کی معلمی ہوگی، اکتوبر میں انشاء اللہ ملاقات ہوگی۔　　والسلام

۲۰ رستمبر ۶۷ء　　　　معین الدین

(۴۳)

مکرمی السلام علیکم

ادھر آپ کئی مرتبہ یاد آئے، آپ کا مضمون موقع سے آگیا، میں وطن کے لئے ٹکٹ بدست تھا، اگر کل مضمون آتا تو پھر واپسی کے بعد رسید جاتی، ابھی میں نے اس کو پڑھا نہیں ہے آپ کے قلم سے ٹھیک ہی ہوگا واپسی کے بعد پڑھوں گا مگر اس کی اشاعت کے لئے کچھ دنوں انتظار کرنا پڑے گا ادھر تاریخ وتراجم پر بہت سے مضامین آگئے ہیں ان کی اشاعت کے بعد آپ کا مضمون شایع ہوگا، انشاء اللہ، زیادہ تاخیر ہوگی۔　　والسلام

۲۰ / مارچ ۶۶ء　　　　معین الدین

(۴۴)

مکرمی السلام علیکم

آپ کے مضمون کا ضمیمہ مل گیا اس کو مضمون میں شامل کر دیا جائے آج کل مضامین کا بڑا ذخیرہ جمع ہو گیا ہے میں کوشش کروں گا کہ آپ مضمون جلد شایع لیکن اگر کچھ تاخیر ہو جائے تو انتظار کیجئے گا میں مکان گیا تھا خورشید سے ملاقات ہوئی تھی، اب تو آپ کی آمد کا زمانہ قریب آرہا ہے۔

والسلام

یکم اپریل ۶۸ء　　معین الدین

(۴۵)

قاضی صاحب! السلام علیکم

ایک مرتبہ آنے کے بعد آپ ایسے لاپتہ ہوئے کہ پھر صورت نہیں دیکھی ایک بات عرصہ سے آپ سے پوچھنا تھا مگر بھول جاتا تھا آج اتفاق سے یاد آگئی

دارالحرب کے مسئلہ پر مولانا سعید احمد اکبرآبادی کے جواب میں البلاغ میں جو مضمون نکلا تھا وہ کس کا تھا، اس وقت تو آپ پابہ رکاب ہوں گے خدا کرے روانگی سے پہلے یہ خط آپ کو مل جائے۔

۳؍جون ۶۸ء　　معین الدین

(۴۶)

دارالمصنفین، اعظم گڑھ　　نمبر ۲۱۸

مکرمی السلام علیکم

میں اس طرف تھوڑے تھوڑے وقفہ سے سفر میں رہا عید سے واپسی کے بعد پھر لکھنؤ اور سہارنپور چلا گیا وہاں سے واپسی میں فلو میں مبتلا ہو گیا آپ کا خط میری عدم موجودگی میں

آیا تھا ان اسباب کی بنا پر جواب میں تاخیر ہوئی، آج آپ کی کتاب منگائی ہے، اجمالی نظر ڈالنے کے بعد لکھوں گا اس مہینہ میں تو شذرات میں شاید جگہ نہ نکل سکے گی، مطبوعات جدیدہ کے ماتحت زیادہ تفصیلی تعارف ہوتا ہے شذرات میں تو صرف چند سطروں کی گنجائش نکلتی ہے، بہرحال جہاں مناسب ہوگا جلد تبصرہ کی کوشش کی جائے گی مبارک باد تو پیشگی دے دیتا ہوں کہ آپ نے عربی میں بھی ایک مفید کتاب لکھ دی اور متفرق تراجم کو ایک جگہ جمع کر دیا۔ والسلام

معین الدین

۴ر فروری ۶۹ء

............(۴۷)............

دارالمصنفین، اعظم گڑھ

مکرمی السلام علیکم

تازہ البلاغ میں اسلامک اسٹڈیز کانفرنس کی روداد دیکھی، آپ نے آئندہ نمبر میں خطبہ استقبالیہ اور خطبۂ صدارت شائع کرنے کا خیال ظاہر کیا ہے خطبہ استقبالیہ بہت جلدی میں لکھا گیا تھا، اس لئے اس میں بعض چیزیں رہ گئی تھیں، معارف میں شائع شدہ خطبہ میں یہ کمی پوری کر دی ہے اس لئے اگر آپ خطبہ شائع کریں تو معارف والا شائع کیجئے گا یہ ترمیمیں بہت جزوی ہیں البتہ اخیر میں ایک پیراگراف بڑھایا ہے وہ ضرور ہونا چاہے احتیاطاً ایک پرچہ پھر آپ کے نام بھیج دیا ہے۔ والسلام

معین الدین

۲۱ر جنوری ۷۰ء

............(۴۸)............

اعظم گڑھ

مکرمی السلام علیکم

میں اس طرف سفر میں تھا کیم اکتوبر کو واپس آیا تو ڈاک میں آپ کا خط ملا، اس لئے

جواب میں تاخیر ہوئی آپ کی مخلصانہ مبارک باد کا دل سے شکر گذار ہوں (۱) آپ جیسے اہل علم کی مبارک باد حقیقی مبارک باد ہے خدا کرے خورشید کی مشکل حل ہو گئی ہو۔ اور سب خیریت ہے۔

والسلام

۵/اکتوبر ۷۰ء معین الدین

(۴۹)

دارالمصنفین، اعظم گڑھ

مکرمی السلام علیکم

مضمون ملا، ابھی جستہ جستہ پڑھا ہے، بہت پسند آیا، آپ اطمینان رکھئے میں نزہۃ الخواطر سے اختلاف میں کوئی ترمیم نہ کروں گا علمی اختلاف میں کوئی مضائقہ نہیں اگر نومبر کے پرچہ میں جگہ نکل سکی تو نومبر ہی سے اشاعت شروع ہو جائے گی ورنہ پھر جنوری میں اس لئے کہ دسمبر میں معارف کی ششماہی جلد ختم ہو جاتی ہے۔

آپ کا پہلا مبارک باد کا خط ملا تھا اس وقت میں موجود نہیں تھا یکم اکتوبر کو واپس آیا تو ڈاک میں آپ کا خط ملا، اس لئے جواب میں تاخیر ہوئی تھی، امید ہے کہ مل گیا ہوگا۔

۱۳/اکتوبر ۱۹۷۰ء معین الدین

(۵۰)

دارالمصنفین، اعظم گڑھ

مکرمی السلام علیکم

خط ملا، مجھے آپ سے زیادہ آپ کے مضمون کی اشاعت کی فکر ہے مگر ملا صاحب ختم ہونے کا نام ہی نہیں لیتے، اس کی وجہ سے کئی مضامین رکے ہوئے ہیں میں دو مرتبہ مولانا رضا کو لکھ چکا ہوں کہ اب اس کو ختم کیجئے بڑا حرج ہو رہا ہے، انھوں نے وعدہ کیا ہے کہ مارچ میں ضرور

---

(۱) شاہ صاحب کو صدر جمہوریہ ہند کی طرف سے ایوارڈ ملا تھا قاضی نے اسی پر مبارک باد دی تھی (مصنف)

ختم ہو جائے گا دیکھئے کیا نتیجہ نکلتا ہے اولاً کئی نمبر نکل چکے ہیں دوسرے مولوی رضا سے تعلقات اس قسم کے ہیں کہ روک دینا مناسب نہیں معلوم ہوتا مگر اب امید ہے کہ مارچ میں ختم ہو جائے گا اور اپریل سے انشاء اللہ آپ کے مضمون کی اشاعت شروع ہوگی آپ نے صرف ایک شخص کا حال لکھا ہے اور مولانا رضا نے پورے خاندان کی تاریخ لکھدی ہے ورنہ ملک العلماء کی حد تک آپ کا مضمون اسی ٹکر کا ہے اور امید ہے کہ سب خیریت ہوگی۔

۱۰ر فروری ۷۱ء معین الدین

..........(۵۱)..........

دارالمصنفین، اعظم گڑھ

مکرمی السلام علیکم

امید ہے کہ آپ مع الخیر ہوں گے، ملا نظام الدین نے اب جا کر ملک العلماء کے لئے جگہ خالی کی ہے، اپریل کے پرچہ سے مضمون کی اشاعت شروع ہوگی کتابت کے لئے دیدیا ہے بہت دنوں آپ کو انتظار کرنا پڑا مولانا رضا ابھی اور بھی سلسلہ دراز کرنا چاہتے تھے مگر میں نے لکھ دیا کہ اب کچھ دنوں کے بعد لکھیں ملک العلماء بہت دنوں سے انتظار میں بیٹھے ہیں، میں پرسوں باہر جا رہا ہوں اپریل کے پہلے ہفتہ میں واپسی ہوگی۔

۱۶ر مارچ ۷۱ء معین الدین

..........(۵۲)..........

دارالمصنفین، اعظم گڑھ

مکرمی السلام علیکم

خط ملا، اپریل کا پرچہ آج بھیج دیا گیا خدا کرے مل جائے مولانا ابوالوفاء کو حیات شبلی ہدیۃً بھیج دی گئی اگر انھوں نے مجھے لکھا ہوتا تو بھی بھیج دی جاتی ان کا وجود بڑا غنیمت ہے اور

دارالمصنفین کے بڑے مخلصوں میں ہیں ان کو خط بھی لکھ دیا ہے خورشید ردولی میں ہیں غالباً ہفتہ عشرہ میں مقالہ کی تیاری کے لئے یہاں آئیں، امید ہے کہ آپ کے آنے تک رہیں گے اور آپ سے ملاقات ہوگی۔

۲۹ر اپریل ۷۱ء　　　　معین الدین

..........(۵۳)..........

دارالمصنفین، اعظم گڑھ

مکرمی السلام علیکم

آپ کا خط ملا مطلوبہ پرچہ آج بھیج دیا گیا خدا کرے پہنچ جائے خورشید آئے تھے ایک عشرہ رہ کر کل واپس گئے، انھوں نے آپ کو خط بھی لکھا ہے ان کا کالج تو ۱۵ر جون سے کھلے گا لیکن وہ یکم کو روانہ ہو جائیں گے۔　　　　والسلام

۲۶ر مئی ۷۱ء　　　　معین الدین

..........(۵۴)..........

دارالمصنفین، اعظم گڑھ

۲۱ر جون ۷۱ء

مکرمی السلام علیکم

یقین ہے کہ جون کا معارف مل گیا ہوگا باقی مضمون کے ساتھ ایک حادثہ پیش آ گیا ہے جو معارف کی تاریخ میں بالکل نیا ہے چوتھی قسط غفار خان کو لکھنے کے لئے دی تھی وہ ان سے کہیں گم ہوگئی اور باوجود تلاش کے نہیں مل رہی ہے اس لئے اس کے علاوہ کوئی اور شکل نہیں ہے کہ آپ اتنا حصہ دوبارہ لکھئے گو دوبارہ لکھنے کی دشواری سے میں خوب واقف ہوں اس سے بڑھ کر دشوار کام کوئی نہیں ہے اگر کوئی کٹا پٹا مسودہ موجود ہو تو کچھ آسانی ہوگی ورنہ نئے سرے سے

لکھنا تو بہت دشوار ہوگا اور اگر تیسرے نمبر پر ختم کر دیا جائے تو مضمون ناقص رہ جائے گا، غفار خاں سے بھی کچھ کہتے نہیں بن پڑتا یہ ان کی غلطی ہے کہ نے بے احتیاطی برتی لیکن اب تو مضمون گم ہو چکا وہ بھی مجبور ہیں۔

۲۱/جون ۷۱ء معین الدین

............(۵۵)............

مکرمی السلام علیکم

آپکا خط ملا، شیخ وجیہ الدین کا نام تو مجھے بھی معلوم تھا البتہ بحرذخار کا سنہ تصنیف نہیں معلوم تھا اصل تلاش ان کے حالات کی ہے۔

جی ہاں ہم لوگ بمبئی آرہے ہیں ۲۶/اپریل کو انشاءاللہ پہنچیں گے علی میاں مولانا عبدالماجد صاحب اور عمران خاں پورا قافلہ ہوگا۔

۱۳/اپریل ۷۲ء معین الدین

............(۵۶)............

اعظم گڑھ

مکرمی السلام علیکم

مضمون مل گیا، یہ سلسلہ بہت مفید ہے ابھی جونپور کے ایک صاحب نے دیوان عبدالرشید پر مضمون لکھ کر بھیجا ہے جو جون کے پرچے میں چھپ رہا ہے اب دیار مشرق کے اصحاب...... کا تذکرہ مکمل ہو جائے گا امید ہے کہ آپ بخیریت ہوں گے۔

۱۳/جون ۷۲ء معین الدین

(۵۷)

دار المصنفین، اعظم گڑھ

مکرمی السلام علیکم

تبصرہ مل گیا یہ اتنا مفصل ہے کہ اس کے بعد معارف میں تبصرہ کی ضرورت نہیں رہی آپ نے میرا کام ہلکا کر دیا اس کے بارہ میں آج ہی علی میاں کا خط آیا ہے ان کو بھی یہی لکھ دیا ہے، وہ اگست ہی میں چاہتے تھے، مگر اس مہینہ میں گنجائش نہیں ہے ستمبر میں شایع ہوگا، البتہ قاضی امان اللہ بنارسی اسی مہینہ میں ہوں گے۔

۳/اگست ۷۲ء معین الدین

(۵۸)

دار المصنفین، اعظم گڑھ

مکرمی السلام علیکم

مضمون مل گیا ابھی میں نے پڑھا نہیں ہے، کاتب کو دیتے وقت پڑھوں گا، آپ اپنے مشرق کی تمام اہم تاریخی شخصیتوں کو زندہ کر دیا یہ بڑا کام کیا۔

مکتب ابناء غلام رسول کے مالک کی وفات سے افسوس ہوا ان کے ذریعہ بڑی علمی خدمت انجام پائی اللہ تعالیٰ مغفرت فرمائے، انشاء اللہ اگست میں ملاقات ہوگی۔

۲۵/جون ۷۴ء معین الدین

☆☆☆

کتابیات

(الف)

(۱) اسلام اور عربی تمدن۔ مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی۔ دارالمصنفین، اعظم گڑھ۔ ۱۹۵۲ء

(۲) ادبی نقوش۔ مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی۔ ادارہ فروغ اردو لکھنؤ۔ ۱۹۶۰ء

(۳) اقبال نامہ۔ شیخ عطاء اللہ۔ شیخ مبارک علی، لاہور۔ ۱۹۵۰ء

(۴) انوار العیون فی اسرار المکنون۔ شیخ عبدالقدوس گنگوہی، ترجمہ: مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی۔ معارف پریس، اعظم گڑھ۔ ۱۹۲۸ء

(ب)

(۵) بزم صوفیہ۔ سید صباح الدین عبدالرحمٰن۔ دارالمصنفین، اعظم گڑھ۔ ۱۹۷۱ء

(۶) بزم رفتگان۔ " "

(پ)

(۷) پرانے چراغ حصہ اول۔ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی۔ مکتبہ فردوس لکھنؤ۔ ۱۹۷۵ء

(ت)

(۸) تاریخ اسلام اول۔ مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی۔ دارالمصنفین، اعظم گڑھ۔ ۱۹۹۶ء

(۹) " دوم " " ۱۹۸۸ء

(۱۰) " سوم " " ۱۹۴۴ء

(۱۱) " چہارم " " ۱۹۹۳ء

(۱۲) " تابعین " " ۱۹۳۸ء

(۱۳) تعمیر حیات لکھنؤ (شاہ معین الدین احمد ندوی نمبر) مرتبہ: مولانا اسحاق جلیس ندوی۔ مارچ اپریل ۱۹۷۵ء

(ج)

(۱۴) چند بزرگوں کے خطوط۔ مولانا محمد عثمان قاسمی۔ علمی کتاب گھر، شاہ گنج۔ ۱۹۹۲ء

(ح)

(۱۵) حیات سلیمان۔ شاہ معین الدین احمد ندوی۔ دار المصنفین، اعظم گڑھ۔ ۱۹۸۰ء

(خ)

(۱۶) خریطۂ جواہر۔ مرتبہ: شاہ معین الدین احمد ندوی۔ دار المصنفین، اعظم گڑھ۔ ۱۹۷۵ء

(د)

(۱۷) دار المصنفین کی ادبی خدمات۔ ڈاکٹر خورشید نعمانی۔ رحیمی پریس، بمبئی۔ ۱۹۷۷ء

(۱۸) دار المصنفین کی تاریخی خدمات۔ ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی۔ خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ۔ ۲۰۰۲ء

(۱۹) دار المصنفین کی تاریخ اور علمی خدمات۔ ڈاکٹر خورشید نعمانی۔ دار المصنفین، اعظم گڑھ۔ ۲۰۰۳ء

(۲۰) دبستان شبلی کے چند نامور ادیب و انشاپرداز۔ اثر انصاری۔ مئو

(۲۱) دین رحمت۔ شاہ معین الدین احمد ندوی۔ دار المصنفین، اعظم گڑھ۔ ۱۹۶۷ء

(ذ)

(۲۲) ذکر رفتگاں۔ محمد ایوب واقف۔ قادری پریس، اعظم گڑھ۔ ۱۹۸۶ء

(س)

(۲۳) سیر الصحابہ جلد سوم۔ شاہ معین الدین احمد ندوی۔ دار المصنفین، اعظم گڑھ۔ ۱۹۶۷ء

(۲۴) 〃 جلد ششم 〃 〃 ۱۹۸۰ء

(۲۵) 〃 جلد ہفتم 〃 〃 ۱۹۳۳ء

(ش)

(۲۶) شاہ معین الدین احمد ندوی۔ مرتبہ: ڈاکٹر آدم شیخ۔ انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ، بمبئی۔ ۲۰۰۱ء

(۲۷) شیخ احمد عبد الحق ردولوی۔ شاہ مبین احمد فاروقی (ب ت)

(۲۸) شبلی کالج میگزین (مولانا عبدالسلام ندوی کی یاد میں)۔ مرتبہ: کبیر احمد جائسی۔ ۱۹۵۸ء

(ع)

(۲۹) عرب کی موجودہ حکومتیں۔ شاہ معین الدین احمد ندوی۔ دارالمصنفین، اعظم گڑھ ۱۹۳۴ء

(۳۰) علامہ سید سلیمان ندوی، بحیثیت مورخ۔ ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی۔ خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ۔ ۲۰۰۱ء

(۳۱) عظمت کے نشاں۔ ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی۔ ادب کدہ، مہراج پور، انور گنج، اعظم گڑھ۔ ۲۰۰۵ء

(ک)

(۳۲) کاروان زندگی۔ مولانا علی میاںؒ۔ مکتبہ فردوس لکھنؤ

(م)

(۳۳) مشاہیر کے خطوط۔ عبداللطیف اعظمی۔ مکتبہ جامعہ، دہلی۔ ۱۹۷۵ء

(۳۴) مشاہیر کے خطوط بنام مولانا علی میاںؒ۔ مرتبہ: محمد یٰسین کوپر گانوی۔ مکتبہ فردوس، لکھنؤ

(۳۵) مکتوبات حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریاؒ، حصہ دوم۔ ڈاکٹر محمد اسماعیل میمن مدنی۔ دارالاشاعت، کراچی۔ ۲۰۰۴ء

(رسائل)

(۳۶) الفرقان لکھنؤ (ماہنامہ)۔ مدیر: مولانا محمد منظور نعمانی۔ جنوری ۱۹۷۵ء

(۳۷) البلاغ بمبئی (ماہنامہ)۔ مدیر: قاضی اطہر مبارکپوری۔ جنوری ۱۹۷۵ء

(۳۸) برہان دہلی (ماہنامہ)۔ مدیر: مولانا سعید احمد اکبرآبادی۔ جنوری ۱۹۷۵ء

(۳۹) سب رس حیدرآباد (ماہنامہ)۔ مدیر: محی الدین قادری زور۔ جنوری ۱۹۷۵ء

(۴۰) ہماری زبان دہلی (ہفت روزہ)۔ مدیر: ڈاکٹر خلیق انجم۔ ۱۵ جنوری ۱۹۷۵ء

(۴۱) معارف اعظم گڑھ (ماہنامہ) مدیر: شاہ معین الدین احمد ندوی (مختلف شمارے)

❋❋❋❋

مصنف کی دوسری کتابیں

☆ علامہ سید سلیمان ندوی بحیثیت مؤرخ	50/-
☆ دارالمصنفین کی تاریخی خدمات	200/-
☆ عظمت کے نشاں	200/-
☆ اسہل التجوید	15/-
☆ علم الترتیل	10/-
☆ تذکرۃ القراء	50/-
☆ ساحلوں کے شہر میں	25/-
☆ اشاریہ ماہنامہ الرشاد	150/-
☆ شاہ معین الدین احمد ندوی حیات وخدمات	100/-
☆ قرائے عظام اور ان کے علمی ودینی کارنامے	زیر طبع
☆ علامہ شبلی کے علمی کارنامے	”
☆ چند شعرائے اعظم گڑھ	”
☆ مطالعہ شبلی: چند اور زاویے	”
☆ متاع رفتہ	”

ملنے کا پتہ

ادبی دائرہ، اعظم گڑھ (ادا)

کاروانِ رفتگاں

از

حضرت مولانا مجیب اللہ ندوی رح

مرتبہ

ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی



ادبی دائرہ

اعظم گڑھ (یو۔پی)

PRINT ART DELHI Ph. & Fax : 23634222